حقوق محفوظ ہیں ﴿۱۰﴾ سلسلۂ اشاعت نمبر

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ
اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است
(عرفی)

صحیفۂ ادب

یعنی

فنِ شاعری کی حقیقت اور بندائے سخن میرزا غالب کے دیوانِ اُردو پر

بسیط مقدّمہ

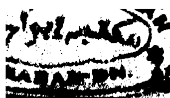
مرتبہ و مؤلفہ

شیخ عبدالرحمٰن طارق منشی فاضل

دارالتالیف ہندی کی دروازہ لاہور سے شائع ہوئی

سنہ ۱۹۳۵ء

بار اول دو ہزار جلد



انتساب

ہر اُس محترم دوست کے نام جو اپنے دل میں زبان و ادب کے فروغ، اور مذاقِ سلیم کی حمائت کے لئے سچا جوش رکھتا ہو:-

جانم بفدائے آنکہ او اہلِ بود　　سر در قدمش اگر نہم سہل بود
خواہی کہ بدانی بہ یقیں دوزخ بود　　دوزخ بجہاں صحبتِ نااہل بود

یہ عمومیت اور مساوات میں نے اس لئے قائم کی، کہ یہاں کا معیارِ شرافت محض حسنِ ذوق ہے، اور جو لوگ اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں، وہ اس ضمن میں کسی رعائت کے مستحق نہیں، اگر ایک مُردہ انسان کسی زندہ شخص کے مساوی نہیں ہو سکتا، تو ہم بھی ان سے مجتنب اور کنارہ کش رہنے پر معذور ہیں:-

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کُشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست

طارق

مطمحِ نظر

ہاتف نے ایک روز مجھے تحریری خدمات پر آمادہ ہونے کی ترغیب ان الفاظ میں دلائی :-

بر کشت و خیابان پیچ بر کوہ و بیابان پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بسحاب اندر

اس رُوح افزا پیغام کو سُنکر جس حُسنِ عقیدت اور جوشِ قلبی سے میں نے اس کا استقبال کیا ، اور اسکے بعد جو مطمحِ نظر کم از کم اپنے لئے تجویز کر سکا ، وہ حسبِ ذیل ہے :-

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمّتِ مردانہ!

طارز

فہرست

تقریظات

کہتی ہے ہمکو خلقِ خدا غائبانہ کیا!

ذیل میں ہم وہ تمام خیالات اور تاثرات ناظرین کی خدمتمیں پیش کئے دیتے ہیں، جو "صحیفۂ ادب" اور خود ہمارے لائحۂ عمل کے متعلق بعض مقتدر اور صاحبِ ذوق حضرات کی طرف سے ریویوز کے طور پر موصول ہوئے ہیں، ہم ان تمام صاحبان کے اسلئے بھی خاص طور پر ممنون ہیں، کہ انہوں نے حقائق اور واقعات کا اظہار انتہائی فراخدلی سے کیا ہے، اور اسمیں کسی طرح کی رقابت کو قطعاً دخل نہیں دیا، ہم اپنے مقاصد کی وحدت اور ذوق و عمل کی اس مبارک جستجو کو ملحوظ رکھتے ہوئے دنیائے صحافت سے بھی متوقع ہیں، کہ وہ انہیں زرین اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے رواداری اور یگانگت کا پورا پورا ثبوت بہم پہنچائیگی۔

(مصنف)

از جناب حافظ سیّد طلحہ صاحب ایم۔ اے

پروفیسر پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور

"ہمارے دوست جناب عبدالرحمٰن صاحب طارق نے "صحیفۂ ادب" کے

تحریر فرمایا ہے، جس میں زبان اُردو کی موجودہ حالت اور اہل وطن کی اس سے بے اعتنائی کا ذکر نہایت دلسوزی سے کیا ہے، اور ساتھ ہی اُن اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو اُردو زبان اور اُردو ادب کی ترقی کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں، اصل کتاب میں پہلے شعر کی حقیقت اور شعر و شاعری کے لوازم سے بحث کی گئی ہے، جو بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، اسکے بعد مرزا غالب کی شاعری پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے، غالب کی شاعری پر تنقید و تبصرہ کا رواج آجکل بہت عام ہو رہا ہے، لیکن اسمیں شک نہیں، کہ طارق صاحب کا تبصرہ بہت سی جدتوں کا حامل ہے، اور میری رائے میں یہ نئی طرز کے تنقید نگاروں کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوگا۔ کتاب کی افادی حیثیت کے علاوہ مصنف کا انداز بیان اچھوتا اور دلکش اس قدر ہے کہ اُردو کے بہی خواہوں کو فاضل مصنف کی محنت کی دل کھول کر داد دینی چاہیئے، میں جناب طارق کی مزید کامیابیوں کیلئے دُعا گو ہوں۔"

از جناب مولانا علم الدین صاحب سالک ایم، اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

"میرزا غالب ہندوستان کے وہ جلیل القدر شاعر ہیں جنکی شاعری نے دوست اور دشمن دونوں کے دلوں کو مسخر کر لیا ہے، جُوں جُوں وقت گذرتا جائیگا، غالب کی شاعرانہ قدر و منزلت بڑھتی جائے گی، ایک وقت

تھا، کہ میرزا غالب خود لوگوں کی بے توجہی اور ناقدردانی سے متاثر ہوکر کہا کرتے تھے :-

تو اے کہ محوِ سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح فرمایا کرتے تھے :-

یخ فروشم در تموز و کلبہ دُور از چار سُو
ہیرو و سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

یا آج یہ حال ہے، کہ میرزا غالب کا دیوان اپنے پاس رکھنا فیشن میں داخل، اور اُس کے کلام کی شرح لکھنا معیار قابلیت بن گیا ہے، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں غالب کے کلام کی بہت سی شرحیں شائع ہوگئی ہیں، لیکن مرزا غالب کی شرح نگاری یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اس کا سلسلہ بدستور جاری ہے، حال ہی میں ایک نوجوان ادیب جناب طارق نے "صحیفۂ ادب" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، جس میں مرزا غالب کے شاعرانہ محاسن گنواتے ہوئے آپ نے جا بجا مشکل اشعار کی شرح بھی کر دی ہے، کتاب مذکور دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں فاضل مصنف نے شعر و شاعری پر ایک پُر مغز مقالہ لکھا ہے، جس میں مشرق مغرب کے مُستند نقادان فن کی کتب سے استفادہ کرنے کے علاوہ ذاتی اجتہاد سے بھی کام لیا ہے، شعر و شاعری کی یہ بحث بہت دلچسپ اور عُمدہ ہے، اس کا مطالعہ فنِ شعر سے وابستگی رکھنے والوں کیلئے فائدہ

سے خالی نہ ہوگا، فنی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ہر جگہ مرزا غالب کے کلام سے استناد کیا ہے، جس سے مضمون بیحد دلاویز بنگیا ہے،

دوسرا حصہ خاص میرزا کی شاعری سے متعلق ہے، اس میں بھی ہمارے نوجوان ادیب نے خوب ہی دادِ سخن دی ہے، اور مختلف عنوانات کے ماتحت غالب کے کلام پر دل کھول کر بحث کی ہے، آپ نے غالب کے کلام کا موازنہ مشرق و مغرب کے دوسرے شعراء سے بھی کیا ہے، جس سے آپ کے وسعتِ مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، غرض کتاب میں جدیدیت کی روح ہر طرح کارفرما ہے، خدا کرے اسے وہ مقبولیت حاصل ہو، جس کی یہ بدرجۂ غائت مستحق ہے"

از جناب صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور

"میں نے منشی عبدالرحمٰن صاحب طارق کی تصنیف "صحیفۂ ادب" کا مطالعہ کیا، اس کتاب میں مصنف موصوف نے اردو شاعری اور اسکے بعد مرزا غالب کی شاعری پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے، اسی ضمن میں بعض نہائت اہم امور بھی زیرِ بحث آگئے ہیں، جو اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت کار آمد ہیں، مرزا غالب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے بعض نہائت مفید باتیں بیان کر دی ہیں، جن سے

مشرق کے اس جلیل القدر شاعر کی ادبی حیثیت متعین ہوگئی ہے ؎
جناب طارق کی یہ ادبی کوشش قابل قدر ہے ؎

از جناب خانصاحب قاضی فضل حق ایم اے پی ای ایس

لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور

میں نے "صحیفہ ادب" کا بغور مطالعہ کیا، کتاب بہت پسند آئی، فاضل مصنف نے نفسیات شعری کو نہائت خوبی سے پیش کیا ہے، اسکے علاوہ طرز تنقید میں بھی ایک ایسی جدت اور دلاویزی پیدا کردی ہے، جو ملک کے نوتعلیمیافتہ طبقہ کے لئے بھی اپنے اندر جاذبیت اور دلچسپی کا کافی سرمایہ لئے ہوئے ہے،

اس سے پہلے بھی بعض لوگوں نے غالب کی شاعری پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ اس سے ذوق کو خاطر خواہ طور پر تسکین حاصل نہیں ہوتی، مضامین کی ترتیب و تنسیق اور معانی کا ضابطہ بجائے خود سب سے بڑا اور اہم کام تھا، جس میں مؤلف صحیفہ ادب" نے پوری کامیابی حاصل کرلی ہے،

توضیح مطالب میں مثالیہ اشعار بھی نہائت موزونیت سے چسپاں ہوئے ہیں، انگریزی نظموں کے تراجم بھی نہائت چست اور زوردار واقع ہوئے ہیں، الغرض کتاب کو ایک نظر دیکھ لینے سے بھی مصنف کے حسن انداز

اور روانی طبع کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے، میں یقین کرتا ہوں، کہ ایسی نمایاں اور ممتاز چیز کی اتنی ہی قدر افزائی کی جائیگی۔ جتنی کہ اُس کے لئے سزاوار ہے۔"

از حضرت مولانا اصغر علی صاحب روحی

سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

"میں نے صحیفہ ادب مؤلفہ منشی عبدالرحمن صاحب کا مطالعہ کیا اس میں شعر کی تحقیق ایک نئے پیرایہ میں قلمبند کی گئی ہے، جس کا ہمیں فراخ حوصلگی کے ساتھ خیر مقدم بجالانا ضروری ہے، لائق مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے، اُردو زبان کے دلدادگان کے لئے زبان اُردو میں ایک بہترین اضافہ ہے، میرے خیال میں یہ کتاب اس قابل ہے، کہ پنجاب یونیورسٹی کے صیغہ امتحانات اُردو میں اس کو بطور نصاب لے لیا جاوے۔"

دیباچہ

از

مُبصّرِ فن حضرت مولانا سیّد ولادحسین صاحب شادان بلگرامی

پروفیسر آف اورینٹل کالج لاہور

اہلِ پنجاب میں یہ خاص خوبی ہے، کہ بیکار نہیں بیٹھتے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں، یہ فطرت اُن کی عام ہے، کہ محنتی واقع ہوئے ہیں، خصوصاً اُردو کے ساتھ تو ان کو وُہ شغف ہے، کہ قابلِ بیان نہیں، روزانہ نت نئی کتابیں جدت سے بھری شائع ہوتی رہتی ہیں، کونسا ایسا علم، فن، صنعت وحرفت ہے، کہ اس میں اچھی یا بری تصنیف پنجاب سے شائع آئے دن نہوتی رہتی ہو، حیدرآباد کو چھوڑ کے تمام ہندوستان کے تصانیف ایک طرف اور پنجاب کے ایک طرف پنجابیوں نے اردو کا وُہ کام کیا، کہ اہلِ زبان سے نہ ہوسکا۔ زبان اُردو ان کی ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گی، حیدرآباد اور پنجاب کی وجہ سے اُردو کا ستارہ اگر

کلاسکل لینگویج میں نہ کیا جائے۔ تو وسیر ظلم ہے، جو لوگ یورپین زبانوں کی تصانیف کے تراجم کے لئے اسے ناکافی سمجھتے ہیں، وہ خود اُردو زبان پر قدرت نہیں رکھتے ہیں، ورنہ اس میں اس قدر سرمایہ موجود ہے، کہ کسی جگہ یہ عاجز و مجبور نہیں، جن کو زبان اُردو پر قدرت حاصل تھی، اُنہوں نے یورپین تصانیف کے تراجم کر کے اس کی سرمایگی کو ثابت کر دیا، حکومت انگریزی سے پہلے شاہان ہندوستان ایرانی تھے، اس لئے انہوں نے دفتری زبان فارسی رکھی، اور اُردو کی تربیت کی طرف ان کی توجہ نہ ہوئی، اور مصطلحات علوم و فنون مصنفین اپنی تصانیف میں عربی و فارسی سے مستعار لیتے رہے۔ لیکن حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ نے اس کمی کو باحسن وجوہ پورا کر دیا، اور کسی قسم کی کمی اب نہیں رہی، بنا بر قول مشہور اُردو کی عہد طفولیت میں شاہجہان نے پرورش کی، مگر علم سے مالا مال اعلیحضرت میر عثمان علی خانصاحب بہادر بالقابہٗ نے کر دیا۔

شیخ عبدالرحمٰن صاحب طارق اسی تیدار مغز صوبہ کے ایک ہونہار فرد ہیں، جنہوں نے منشی فاضل اورینٹل کالج لاہور سے پاس کیا، اور اب میٹرک کے بعد ایف، اے بھی پاس کر چکے ہیں، اُردو لٹریچر میں انکا مطالعہ زائد الوصف ہے، اگر یہ دعوٰی ہمسری اہل زبان کریں۔ تو بیجا نہ ہوگا، حال میں انہوں نے ایک دارالتالیف کی بنیاد ڈالی ہے۔ اسی ادارہ سے اُن کی پہلی تصنیف "صحیفہ ادب" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں شعر و شعراء سے فلسفیانہ

اور دلچسپ بحث کرتے ہوئے کلام غالب اعلی اللہ مقامہٗ کے وُہ وُہ نکات بیان کئے ہیں، جن کی طرف ان سے پیشتر کے شارحین کی توجہ نہوئی شرح دیوان غالب لکھنا ان کا مقصد نہیں، بلکہ غالب کے فلسفیانہ خیالات کا اظہار مطلوب ہے، اور اُن کی شاعری کی امتیازی حیثیت کو پبلک کے سامنے پیش کرنا، اور انتقاد صحیح سے کام لینا۔ اس کتاب کے باب اوّل میں مطلق شعر و شاعری سے حکیمانہ بحث کی ہے، اور اپنے دعاوی کو شواہد و اسناد سے مستحکم بنایا ہے، دُوسرے باب میں خاص مرزا کی شاعری اُن کے تخیل کی بلندی اُن کی خوبی ادا، اور خیالات فلسفیانہ کا ذکر آسان اور زود فہم عبارت میں کیا ہے، صنائع بدائع کا بھی ذکر کرتے ہیں، جو شاعری میں صرف کئے جاتے ہیں، حکما و شعرا یورپ کے اقوال و اشعار کے تراجم نہائت خوبی سے کئے ہیں، غرضیکہ اپنے ادّعا کو مستدل بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، غالب کے دیوان کے پہلے شعر کا ذکر بطور مثال کرتا ہوں، کہ دُوسرے شارحین کیا کہتے ہیں، اور یہ اُس میں کس نزاکت کو دیکھتے ہیں،

نقش فریادی ہے کسکی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

خود غالب مرحوم اس مطلع کے معانی یوں لکھتے ہیں:

"ایران میں رسم ہے، کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کے لے جانا، پس شاعر خیال کرتا ہے، کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر

ہے، اس کا پیرہن کاغذی ہے، یعنی ہستی اگرچہ مثل ہستی تصویر اعتبار محض ہو موجب رنج وملال و آزار ہے، غرض مصنّف کی یہ ہے کہ ہستی میں مبدء حقیقی سے غیریت وجدائی ہو جاتی ہے، اور اس معشوق کی مفارقت ایسی شاق ہے، کہ نقش تصویر تک اس کا فریادی ہے، اور پھر تصویر کی ہستی کوئی ہستی نہیں مگر فنا فی اللہ ہونے کی رُو سے بھی آرزو ہے، کہ اپنی ہستی سے نالاں ہے"

ایک بزرگ مرحوم غالب کے بتائے ہوئے معنوں پر اپنی رائے کا اسطرح اظہار فرماتے ہیں:۔

"اس شعر میں جب تک کوئی لفظ ایسا نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونیکا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو، اُس وقت تک اسے بامعنی نہیں کہہ سکتے، کوئی جان بوجھکر تو بے معنی کہتا نہیں، وزن اور قافیہ کی تنگی سے بعض بعض ضروری لفظوں کی گنجائش نہ ہوئی، اور شاعر سمجھا کہ مطلب ادا ہو گیا، اس شعر میں مُصنف کی غرض یہ تھی، کہ نقش تصویر ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا فریادی ہے یہی سبب ہے کاغذیں پیرہن ہونے کا، لفظ ہستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہوئی۔ اس سبب سے کہ قافیہ مزاحم تھا، اور مقصود تھا مطلع کہنا، ہستی کے بدلے شوخی تحریر کہہ دیا، اور اس سے کوئی قرینہ "ہستی" کے حذف پر پیدا نہ ہُوا، آخر خود اُن کے منہ پر لوگوں نے کہدیا، کہ شعر بے معنی ہے"

لیکن طارق کی نظر دوربین اور حقیقت شناس ذیل کی باریکی اور نکتہ کو اس میں دیکھتی ہے کہ:۔

"جس طرح ایک تصویر اپنے مصور کے کمال کو ظاہر کرتی ہے، اُسی طرح دنیا کی ہر

چھوٹی بڑی چیز بھی اپنے صانع حقیقی کے کمال صنعت پر بزبان حال داد دے رہی ہے، لیکن قاعدہ ہے، کہ جب ایک چیز پیدا کی جائے، تو اس پر تنقید بھی ہوتی ہے، پس اس چیز کا فریاد کرنا اس وجہ سے ہوا، کہ اگر مجھے پیدا کیا تھا، تو دیکھنے والوں کو بھی ایک ایسی نظر عطا کی ہوتی، جس سے وہ میرے اسرار و رموز کو کما حقہٗ سمجھ سکتے، گویا شاعرانہ انداز میں ایک شکایت آمیز حمد و ثنا ہے"

اسی طرح کتاب کا ہر صفحہ لطائف ادبیہ سے مالا مال ہے، عناوین جتنے اختیار کئے ہیں، وہ ماہیت شعر پر روشنی ڈالنے کے لئے سب کے سب اہم اور ضروری ہیں، تضمین اشعار بر محل نے مباحث کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے؛

اس سلسلۂ تالیف کی دوسری کتاب فردوس معانی بھی تیار ہے، جس میں ہند کے ممتاز و سر برآوردہ شعراء کا ذکر ہے، اور ان کے روحانی و اخلاقی کلام پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، عنقریب شائع ہو کر اپنی دلفریبیوں سے ناظرین کو اپنا شیفتہ اور فریفتہ بنائے گی، یقیناً ان کی تصانیف اپنی جامعیت اور خوبی انداز کی رو سے قبولیت عامہ کا سہرا اپنے سر باندھیں گی +

۱۶ مارچ ۱۹۳۵ء

شادان بلگرامی

عرضِ حال

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!

برادرانِ وطن! آج ہندوستان میں اُردو زبان کے خلاف آئے دن جس شدّومدّ کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ وُہ کسی سے پوشیدہ نہیں، نہ صرف یہی۔ بلکہ جو لوگ اس فتنے کو، جس کی بنا سراسر جہالت اور کور ذوقی پر ہے، فرو کر دینے کی طاقت اور قابلیّت رکھتے ہیں۔ انہیں بھی اس فرض کا ذرا احساس نہیں، اور باوجود اس غفلت اور سستی کے وُہ خُوب اچھی طرح سے جانتے ہوئے ہیں۔ کہ:

گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزئ پروانہ ہے

خدا جانتا ہے۔ کہ اس بحث میں مجھے کسی فرد یا جماعت کی تخصیص ہرگز منظور نہیں ہے۔ اور اس لئے میں صاف الفاظ میں جتلا دینا چاہتا ہُوں۔ کہ:۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

لیکن ہاں جب مخالفین کی مسلسل اور پیہم کوششوں کو دیکھتا ہوں۔ اور ادھر مسلمانوں کے جمود اور بے حسی پر بھی نظر پڑتی ہے۔ تو اس وقت رنج اور استعجاب سے میری حالت کچھ دیوانوں کی سی حالت ہو جاتی ہے، نوجوان طبقہ سے بھی مجھے بارہا گفتگو اور ملاقات کا اتفاق ہؤا لیکن صد حیف کہ انہیں بھی سوائے یورپ کی اندھا دھند تقلید کے کسی قومی یا ملی فرض کا احساس تک نہیں: زیادہ سے زیادہ انکی زندگی کا جو "شاندار پروگرام" مجھے معلوم ہو سکا، وہ اکبر مرحوم کے الفاظ میں حسب ذیل ہے ——

ہم کیا کہیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

یاد رہے کہ جو قوم صرف ظاہری آرائش ہی پر جان دینے لگتی ہے، اقتصادی زوال کے ساتھ ہی ساتھ اس کے علمی اور ادبی قویٰ بھی خود بخود مضمحل ہو جایا کرتے ہیں؛ دیکھنے میں آیا ہے کہ یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے سند یافتہ بھی زبان کا صحیح استعمال نہیں جانتے ہیں، قواعد کا جاننا تو بڑی چیز ہے، الفاظ کی تذکیر و تانیث تک کا انہیں علم نہیں،

گر ہمیں مکتب است وہمیں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شُد

یہ سب کچھ اپنی ملکی اور مادری زبان سے غفلت برتنے کی وجہ سے ہے، وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قوموں کی زندگی میں ان کے

لٹریچر کی ترویج و اشاعت کو بھی ایک بڑا دخل ہے، جب تک کسی قوم میں یہ ذوق و شوق باقی رہتا ہے، دنیا میں اس کے زور و اثر کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن جونہی یہ سپرٹ فوت، اور یہ جذبہ مفقود ہوا تو ساتھ ساتھ ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ قوم بھی ہمیشہ کیلئے موت کے آغوش میں ہو گئی، لیکن کیجئے کیا کہ مغرب کے دیوانے اس وقت مشرق کو خاطر میں بھی نہیں لاتے ہیں، اور پھر لطف یہ کہ :-

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے
فخریہ وہ بھی سنانے لگے نظم ملٹن
شیخ سعدی تو بزرگوں میں مرے بھی ایدوست
آپکے کون تھے ملٹن ہیں سنئوں حضرت میں؟

اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ میرے نزدیک کسی دوسری زبان کی ادبیات سے مستفید ہونا ہی سرے سے ناجائز ہے۔ ورنہ یہ تو نقصان اور محرومی کا باعث ہوگا، نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا ..... ترجمہ اس کا یہ ہے :

کہ حکمت کو اک گمشدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

اکتساب ہنر کے لئے اس سے زیادہ وسیع اجازت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور انصاف کا نمونہ اس سے بڑھکر آج کون پیش کر سکتا ہے؟ ــــ تنگ نظرفی کا تو اسلام کسی حالت میں بھی قائل نہیں، اس کا عقیدہ ہمیشہ سے وہی عقیدہ چلا آتا ہے، جس کا اظہار نظیری نے اپنے شعر میں کیا :

گر پیر سالکی خبر از طفل راہ پرس [1] شرم از طلب مدار کہ زنار عالم است

باقی رہا یہ سوال کہ اس جگہ "حکمت" سے ہماری مراد کیا ہے، تو اس کی توضیح کے لئے ہم قرآن مجید سے استشہاد کرتے ہیں، چنانچہ یک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ یعنی:- "ہم نے لقمانؑ کو حکمت سے مشرف کیا" تاکہ وہ ہماری اس مہربانی کا شکریہ بجا لائے، اور جو کوئی بھی ہمارا شکر بجا لاتا ہے تو اسمیں وہ اپنی ہی ذات کے لئے بہتری اور فائدہ پاتا ہے، اور جو ناقدری کرتا ہے تو اس کا وبال بھی اس کی اپنی ہی جان پر ہے، اور ہم تو اعمال کے بارے میں اپنے بندوں کی نسبت ہر طرح سے بے نیاز ہیں۔" پھر ایک دوسرے مقام پر فرمایا يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۤءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ "ہم جسے چاہتے ہیں حکمت عطا کرتے ہیں اور جس شخص کو یہ نعمت عظمیٰ تفویض کردی گئی، اس نے گویا خیر کثیر کو پالیا، اور نصیحت تو فقط عقلمند لوگ ہی پکڑتے ہیں۔" اب لفظ "حکمت" اپنے اندر کیا مفہوم رکھتا ہے، "خیر کثیر" کس کو کہتے ہیں، اور پھر "عقلمند" لوگوں کی صفات کیا کیا ہیں؟ ——— ان تمام چیزوں

[1] آیۂ کریمہ: فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ——— "جب تمہیں کسی شے کی نسبت واقفیت نہ ہو۔ تو ارباب علم سے دریافت کرلیا کرو۔"

کی تشریح ایک دوسرے مقام پر اس طرح سے کی : اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ ـ "آسمان و زمین کی پیداوار، اور رات و دن کے اس (منظم) اختلاف میں عقلمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں، وہ عقلمند لوگ جو خدا کو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، غرضیکہ ہر وقت اور ہر حالت میں یاد کرتے ہیں، اور ساتھ ہی کائناتِ عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا غور سے مطالعہ کرتے ہیں، (اس کی حیات اور مقصد حیات کو پورے تدبر سے دریافت کرتے ہیں) اور نتیجہ کار ایک شاہد عادل کی حیثیت میں بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ الٰہی! تو نے یہ کارخانہ بے کار اور لایعنی پیدا نہیں کیا ہے، تیری خدائی ہر قسم کی شرکت سے پاک ہے، بس ہمیں بھی عذابِ دوزخ سے بچالے۔"

اب تو غالباً آپ حکمت کے اس مفہوم کو بخوبی سمجھ گئے ہونگے جسے کہ ابتداءً ایک "گمشدہ لال" سے تعبیر کرتے ہوئے اسکی تحصیل ہر مومن کے لئے ضروری قرار دی گئی تھی، اور اگر اب بھی آپ کوئی چیز سمجھ نہ سکے ہوں، تو اس تمام بحث کا خلاصہ خیّام کی ایک رباعی میں ملاحظہ فرمائیے، وہ کہتا ہے :۔

گر از پئے شہوت و ہوا خواہی رفت		از من خبرے کہ بے نوا خواہی رفت
بنگر چہ کسی و از کجا آمدۂ		می داں کہ چہ می کنی کجا خواہی رفت

یعنی: "اگر تو نے اپنی زندگانی محض ہوا و ہوس ہی میں برباد کر دی تو یاد رکھ کہ موت کے وقت تجھ جیسا محروم انسان اور کوئی نہیں ہوگا اب (کہ صحت بھی ہے اور فرصت بھی) تجھے غور کرنا چاہیئے کہ تو کیا ہے، کہاں سے آیا ہے، کیا کر رہا ہے، اور بالآخر کہاں جائیگا۔"

تو نتیجہ کار ہمیں یہ معلوم ہؤا کہ "حکمت" کا بڑا مقصد انسان کو "معرفت نفس" کا سبق دینا ہے، جس سے کہ حسب ارشاد خداوندی لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ: "ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔" وہ اپنے شرف و فضل کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے، اور یہ بھی بجائے خود ایک ایسا فائدہ ہے، جس کی نسبت آنحضرتؐ نہائت بلیغانہ انداز میں فرما چکے ہیں کہ مَا هَلَكَ امْرُءٌ عَرَفَ قَدْرَهٗ یعنی "جس شخص نے اپنی عظمت اور بزرگی کو پہچان لیا وہ کبھی برباد نہیں ہوگا۔" اور اقبال نے تو گویا بالکل اسی مقصد کے پیش نظر ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ:۔

ز من گو صوفیانِ باصفا را		خدا جویانِ معنی آشنا را
غلام ہمت آں خود پرستم		کہ با نورِ خودی بیند خدا را

اور پھر خیام کی ایک اور رباعی کو بھی، ہم اسی بیان کی ایک نہائت عمدہ اور جامع تصدیق پاتے ہیں، چنانچہ:۔

روزے کہ جزائے ہر صفت خواہد بُود　　قدرِ تو بقدرِ معرفت خواہد بُود
در حسنِ صفت کوش کہ در روزِ جزا　　شرِّ تو بصورتِ صفت خواہد بُود

"جس روز کہ اعمال کا بدلہ دیا جائیگا، تیری عزّت افزائی بھی اسی قدر ہوگی، جس قدر کہ تو معرفت رکھتا ہے، پس تجھے چاہیئے کہ اعمال صالحہ میں انتہائی کوشش سے کام لے، تاکہ اس دن تیری بُرائیاں بھی نیکیوں سے بدل جائیں۔"

کیا میرے نوجوان بھائیوں کو اب بھی شرم نہیں آئے گی کہ ایسے پاکیزہ اور برتر مقصد کے لئے ان کے بزرگوں کے لکھے ہوئے جتنے مفید اور عُمدہ ذخائر ہو سکتے ہیں، وہ تو سب کے سب یورپ کے کتبخانوں میں محفوظ ہوں، وُہ ان سے روشنی اخذ کریں، اور یہ اپنی محکُومانہ ذہنیت کو لئے ہوئے اسی طرح خواب غفلت میں سوئے رہیں، وائے ملا غنی کشمیری! کہ تیرا ارشاد بھی ہمارے لئے عبرت کا فسانہ ہے:-

غنیؔ روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

اس کے بعد جب واعظانِ قوم کی حالت کا معائنہ کیجے تو وُہ اور بھی زیادہ یاس انگیز ہے، کسی ادبی یا لسانی ذوق کا تو کیا ذکر، ان کے نزدیک چند رسمی خطبات ہی کو منبر پر کھڑے ہو کر طوطے کی طرح رٹ دینا زندگی کا انتہائی کمال ہے، علوم اسلامیہ کی سطر سطر اور لفظ لفظ

دیکھ ڈالا، لیکن نہ تو تقریریں دو جملے صحیح طور پر بول سکتے ہیں، اور نہ تحریریں اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر ہیں، اور باوجود ان تمام کوتاہیوں کے شکایت بھی ہے، کہ ملک کا تعلیمیافتہ طبقہ ہمیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، سو بھائی! آپ کے حق میں تو علّامہ اقبال نے بجا ارشاد فرمایا ہے، اور وہ اس طرح کہ :-

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی ۔۔۔ برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی ۔۔۔ فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں نوحہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

باقی رہی آپ کی دینی حیثیت اور مذہبی رواداری، تو اسکی نسبت بھی "جاوید نامہ" میں سعید حلیم پاشا کی زبانی واقعات اور حقائق کا اظہار ان الفاظ میں کیا جا چکا ہے :-

دینِ حق از کافری رسواتر است ۔۔۔ زانکہ ملّا مومن کافر گر است
زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ ۔۔۔ نزد او اُمّ الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ ۔۔۔ آسمانش تیرہ از بے کوکبی
از شکر فنہائے آں قرآں فروش ۔۔۔ دیدہ ام رُوح الامیں را در خروش
کم نگاہ و کورِ ذوق و ہرزہ گرد ۔۔۔ ملّت از قال و اقولش فرد فرد

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

پھر کیا آپ خیال فرما سکتے ہیں، کہ موجودہ جرائد وصحائف کے ایڈیٹر بھی ادب یا زبان کی کوئی مستقل خدمت سرانجام دے رہے ہیں، کیا وُہ سب کے سب فن سے باخبر ہونے کے علاوہ اسکی ترقی اور فروغ کے لئے اپنے دلوں میں کوئی صحیح احساس رکھتے ہیں، کیا وہ اس ذوق و وجدان سے بہرہ ور ہیں، جو ایسی برگزیدہ خدمت کے سرانجام دینے کے لئے سب سے پہلی اور سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اور کیا اُن کا فروغ روحانی یا ان کی بصیرت اس بارے میں اتنی ہی قوی ہے جتنی کہ ہونی چاہیئے ؟' —— یقیناً جواب نفی ہی میں دینا پڑیگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا مقصُود محض پیسے بٹورنا اور ایڈیٹروں کی صف میں اپنا نام درج کرالینا ہے اور بس، جہاں دکانداری ہو وہاں ہمدردی کبھی نہیں آسکتی !' .... کیا یہ ہمدردی کا ثبوت ہے کہ ردّی کاغذ اور بدنما لکھائی کے ساتھ چند غلط سلط چیزیں پبلک کے سامنے پیش کردی جائیں، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں نے اقبال کی شاعری پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا، اور جیسا کہ مطالبہ تھا، ایک ایڈیٹر صاحب کے یہاں بھجوادیا، اس میں شک نہیں کہ رسالہ کثیرالاشاعت ہے، اور ادبی حلقوں میں اچھا تعارف بھی رکھتا ہے، لیکن جب مضمُون چھپا تو علاوہ دیگر تصرفات کے، جو بالعموم کاتبوں کے شرمندۂ احسان ہُوا کرتے ہیں، ایک یہ بھی تھا، کہ جہاں مضرّات خودی

پھر علامۂ موصوف کا یہ شعر :-

تا توانی کیمیا شو گل مشو
درجہاں منعم شو و سائل مشو

ـــــ نقل کرتے ہوئے میں نے اس کی تائید و تصدیق میں ایک حدیث شریف پیش کی، وہاں کاتب نے ایک ایسی افسوسناک (یا مضحکہ خیز) غلطی کا ارتکاب کیا، جو ان لوگوں کا ہمیشہ سے طرۂ افتخار چلا آتا ہے، یعنی اَلْیَدُ الْعُلیَا خَیْرٌ مِنْ یَدِ السُّفْلٰی کی جگہ اللّٰہُ العُلیا خیر من اللہ السّفلےٰ لکھ دیا، تو معلوم ہُوا کہ اگر چاہیں تو چشم زدن میں خداؤں کا بھی ایک ڈھیر لگ سکتا ہے، ایڈیٹر صاحب کو توجّہ دلائی، اور تصحیح کے لئے التجا کی، لیکن وہ حضرت کچھ ایسے "مستقل مزاج" واقع ہوئے تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے، اظہار فرماتے تو اس سے اپنی قابلیّت کو بٹّا لگتا تھا؛ خیر بات آئی گئی ہوئی اور ہم بھی "قہر درویش برجان درویش" پر اکتفا کرتے ہوئے کسی دُوسرے موقع کے لئے خاموش ہو رہے؛ پھر ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کسی مسلم اخبار کے "ایڈیٹر" صاحب سے دوچار ہونے کی ضرورت پیش آئی، خبر تھی کہ فلاں جگہ سیلاب سے گاؤں کے گاؤں تباہ ہو گئے، باشندوں کی حالت بہت خراب ہے، اور اس ضمن میں قارئین سے استدعا ہے کہ وُہ ان "مظلوموں" کیلئے دُعا کریں، میں نے انہیں تبلایا کہ اس لفظ کی تصحیح ہونی چاہیئے، خدا فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ

لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ اور پھر وَمَا اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ
اور پھر اس سے بھی زیادہ مَا اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَا اَصَابَكَ
مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ـــــ تو ان تمام شواہد کے ہوتے ظلم کی نسبت
خدا کی طرف کرنا کسی لحاظ سے بھی ٹھیک نہیں، حضرت اس پر بگڑے
اور لگے اصرار کرنے کہ نہیں صاحب لفظ جس حیثیت میں مستعمل ہوا ہے
وُہ بالکل ٹھیک ہے، اور تصحیح کی چنداں گنجائش نہیں، اس پر ان کی جو
خبر لی گئی اور جتنا کچھ انہیں اس بیجا سینہ زوری پر نادم ہونا پڑا، اسے
آج تک یاد فرماتے ہونگے، پھر ایک اور "ادبی" رسالہ کہ اُس کی بھی کافی
شہرت ہے، میر کی شاعری پر ایک مضمون شائع کرتا ہے' اور اس
میں صریحاً خط عارض کو نامۂ محبوب سے تعبیر کرتا ہے' اور ایسی فحش اور
اظہر من الشمس غلطی پر اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا، شعر یہ تھا:۔

حُسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

اسی طرح ایک اور ماہوار مجلہ "استفادہ کرنا" کی بجائے "استفادہ
حاصل کرنا" لکھتا ہے' اور یہ بھی بجائے خود ایک ایسی فروگذاشت
ہے' جو ایک جگہ نہیں، بلکہ متعدد مقامات پر دیکھنے میں آئی' اب
ایڈیٹر کی عینک اسے دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے؛ لیکن آنکھوں والے
تو ضرور دیکھ لیتے ہیں، پھر ایک جگہ لکھا ہے "کلیم دیر تک استغفار
مانگتا رہا" یہاں بھی اگر گستاخی معاف ہو تو میں عرض کرونگا، کہ محاورہ

حقیقت میں "استغفار مانگنا" نہیں بلکہ "استغفار کرنا" ہے، سند میں ذوق کا ایک شعر لیجئے :-

مری طاعت سے اب تو معصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ، توبہ استغفار کرتی ہے

یہ مشتے نمونہ از خروارے تو محض ناظرین کی اطلاع کے لئے پیش کیا جا رہا ہے، ورنہ تفصیل کی جائے تو پھر قیامت ہی آئے : خدا جانے یہ لوگ ایک میز کرسی حاصل کر لینے پر کہاں کہاں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں، بہرکیف یہ حالت اندھوں میں کانے راجہ بن بیٹھنے والی بات ہے، جس کی اصلاح بھی انہیں کی توجّہ اور کوشش پر موقوف ہے[1]،

پھر بعض سست بنیاد اور بے خبر لوگ آپکو ایسے بھی ملینگے جو کہتے ہیں کہ "صاحب کیا کیا جائے اُردو زبان کا سرمایہ کچھ ایسا محدود واقع ہوا ہے کہ کہ اس میں بیان کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا" تو اس کی جگہ وُہ یہ کیوں ارشاد نہیں فرماتے کہ "ہم پر کچھ ایسی مرگ خاموشی، اور ایسا جمود و سکون طاری ہو رہا ہے کہ وُہ ہمارے دل میں فرض کا صحیح احساس پیدا ہونے نہیں دیتا اس لئے ہمیں معذور رکھا جائے" سچ تو یہ ہے کہ ان صاحبان پر ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا والی مثل صادق آتی ہے، —— نہ طبیعت میں موزونیت ہے اور نہ نظر میں وسعت؛ اور بایں ہمہ بات اس وثوق سے کرتے ہیں، کہ گویا

[1] مستثنیات ہر چیز میں ہُوا کرتی ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ یہاں بھی ہوں، میں نے اس بیان میں ہر جگہ اکثریت کو لحاظ رکھتے ہوئے بحث کی ہے ۱۲ منہ

اسمیں کسی تغلیط یا شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں، سو اگر وہ آنکھیں کھولیں دنیا کی ہوا کھائیں اور محض کوئیں کے مینڈک بنجانے ہی پر اکتفا نہ کریں، تو انہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا، کہ وہ کس جہل مرکّب میں مبتلا ہیں، اے حضرت! جہاں رزمیہ کلام میں انیسؔ جیسے مسلّم الثبوت اُستاد موجُود ہوں، جہاں عشق کی محفل آرائی میں میرؔ، مومنؔ اور داغؔ نے فصاحت کے دریا بہا دیئے ہوں، جہاں فلسفہ اور نفسیات میں غالبؔ جیسی ہستی موجُود ہو، جہاں تصوّف اور معرفت میں میر دردؔ جیسے بزرگ تشریف فرما ہوں، جہاں اخلاقیات میں حالیؔ اور اکبرؔ نے بھی کوئی کمی باقی نہ رکھی ہو، جہاں شوخی اور بذلہ سنجی میں انشاءؔ اور رنگینؔ نے دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہوں، اور پھر جس زبان میں اقبالؔ جیسی ہنگامہ خیز اور ہلچل پیدا کر دینے والی شاعری بھی کار فرما ہو، وہاں الفاظ اور محاورات کی بھلا کیا کمی ہو سکتی ہے، ضرورت صرف شوق کی ہے، اور پھر شوق کے ساتھ ہی ساتھ اس قابلیّت کی ہے، کہ جس سے چیزوں کو اپنے ذہن کے اندر محفوظ رکھتے ہوئے ان کے صحیح اور برمحل استعمال کا پتہ چلایا جاتا ہے، ان کی سند میں جستجو اور کوشش سے کام لیا جاتا ہے، انکو مناسب طور پر تطابق دیا جاتا ہے، جس سے نہ صرف موازنہ و تنقید ہی کا باب کھُلے، بلکہ مضامین میں جدّت کا رنگ بھی نمایاں ہو ــــ اور پھر ان تمام باتوں کو وُہ محنت درکار ہے، کہ جس پر داغؔ نے ایک دفعہ کہا تھا:۔

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو — کہ آتی ہے اُردُو زباں آتے آتے

پھر علاوہ ان تمام خوبیوں کے جو "اُردُو" کو اسوقت حاصل ہیں، معاشرتی

نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے، تو یہ زبان تعصّب اور عناد کی جگہ محبّت اور اتحاد
کی داعی ہے، لیکن مجھے نہائت افسوس سے اظہار کرنا پڑتا ہے کہ بعض ہمسایہ
قومیں جو بے خبری کے عالم میں اپنی زبان کی حمائت کرتے ہوئے اُردو کو اس کا
مدّمقابل ٹھیراتی، اور اسے ایک سوکن کی حیثیت دیکر جھگڑا شروع کر دیتی ہیں
یہ سراسر حقیقت سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہے، میرے مکرّم بھائیو! جو
زبان اسقدر فراخدل اور فرخندہ رُو واقع ہوئی ہو، کہ ہندی آئے تو اُس کو
گلے لگالے، فارسی آئے تو اُسے اپنی آغوش میں جگہ دے، عربی آئے تو اس
کی آؤ بھگت میں کوئی کمی باقی نہ رکھے، اور پھر انگریزی آئے تو اسے بھی اپنی
سر آنکھوں پر جگہ دے؛ وُہ کسی اختلاف یا منافرت کا باعث کیونکر ہو سکتی ہے
یہی وجہ ہے کہ آج اس کی شہرت اور مقبولیت ایک عالمگیر حیثیت اختیار کر
چکی ہے، کہیں بھی اس کے بغیر چارہ نہیں، اس کی فطری لطافت اور پیدائشی
موزونیّت تمام دلوں میں یکساں طور پر اپنا گھر کئے ہوئے ہے، ہر معقول پسند
انسان اسے ہندوستان کی مشترکہ زبان (Lingua Franca)
تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامّل نہیں کرتا، اب بھی اگر کوئی اس نگار سے اُلفت نہ
کرے تو بڑا ہی مُردہ دل اور انتہا درجے کا بدنصیب ہے!

پھر اکثر مصنّفین کا قاعدہ چلا آتا ہے، کہ وہ اپنے مباحث میں غیر ضروری
طور پر ایک دلآزار اور فرقہ وارانہ مسلک اختیار کر لیتے ہیں، یعنی ایک موضوع
پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان فوائد کو جو نوع انسانی کیلئے مشترکہ
حیثیت رکھتے ہیں، محدُود اور مُقیّد بنانے کی کوشش کی جاتی ہے؛ یہ کسی لحاظ

سے بھی قابل تعریف چیز نہیں، فطرت نے سب کو یکساں طور پر بہرہ ور ہونے
کا موقع دیا ہے، لہٰذا کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وُہ اسمیں ذاتی طور پر
کسی قسم کا تصرّف کرے، اور اگر کرے، تو اس کی یہ خصلت قانونی اور اخلاقی
وُجوہ کی بنا پر بھی اسی تنگ محدُود تصوّر کی جائے گی، اسلام کی سیزدہ صد سالہ
روایات محبّت اور یگانگت کیلئے تو ایسی نظیریں بکثرت پیش کر سکتی ہیں، جن
میں ایک شخص کے قول کو ساری قوم کی ذمّہ داری تسلیم کر لیا گیا ہو، لیکن ایسا
واقعہ کوئی بھی نہیں ملیگا، جس میں کہ شر اور زیادتی کی خاطر کسی کی بات مُعتبر
سمجھ لی گئی ہو! یہاں تو خلاف مصلحت بات کے لئے خلیفہ عمرؓ جیسی جلیل القدر
ہستی کے سامنے بھی شمشیر برہنہ کر لی جاتی ہے، پھر کسی دُوسرے کیلئے بھلا
کیا وقعت ہوسکتی ہے: پس جہاں ایک شخص کچھ لکھنے کا ارادہ کرے، وہاں
احتیاط اور سلیقہ اس کو مجبُور کرتا ہے، کہ وہ ایک عالمگیر صداقت کو شخصی
جذبات سے ہرگز مغلوُب نہ ہونے دے!

پھر آج کی دُنیائے انشاء جس فرسُودہ اور پامال روش پر چلی جا رہی ہے
وُہ بھی کسی سے مخفی نہیں، **شعریّت** اور **موسیقی** عبارت کی جان ہیں،
لیکن جہاں تک میں نے غور کیا، اکثر شائقین جنہیں محض پریس کا نام بدنام
کرنا اور اپنا وقت ہی ضائع کرنا آتا ہے، یا بالفاظ دیگر نمائش کا ایک چھوٹا
سودا دماغ میں سمایا ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ زبان وادب کی کوئی
معقول خدمت سرانجام پائے یا نہیں، اس معاملہ میں بھی ناکام کوشش کرتے
دکھائی دیتے ہیں، میں نہیں سمجھ سکا کہ وُہ قلم تو اُٹھاتے ہیں، لیکن قلم کا حق

کیوں ادا نہیں کرتے، کیا ان کے سینے میں دل اور اس دل میں کسی قسم کی توانائی نہیں ہے؟' — اگر ہے، تو ان کی تحریریں کیوں اسقدر بے جان اور پژمُردہ ہوتی ہیں، وہ بیان کا حق کیوں ادا نہیں کرتے؟'..... کیا انہیں معلوم نہیں کہ:-

دلبری بے قاہری جادوگری ست   دلبری باقاہری پیغمبری ست

اور کیا وُہ اس حقیقت سے بیخبر ہیں کہ:-

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات   ہاں درد بنکے دِل میں مگر جا کرے کوئی

خُدارا وُہ سمجھیں، اور سمجھنے کی کوشش کریں، کہ تحریر کا فن علاوہ قُدرتی مناسبت کے قلب وجگر کو خُون کر دینے سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ تو پھر قدُرت کا احسان ہے، جسے چاہے عطا کرے'

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوُری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور پھر :-

نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد وتند نشست   کلاہ داری و آئین سروری داند

سنیئے حضرت! خامہ مضراب بنجائے، اور بین السطور سے زندگی کے نغمے عود کرتے ہوئے دکھائی دیں، جب تو ہے تحریر ورنہ کچھ نہیں!

اور پھر شعر؟' سخن فہمی کا ادّعا؟' — یہ تو ہیں بھی بہت بڑی چیزیں' اسوقت کتنے لوگ ہیں، جو شوق تو ظاہر کرتے ہیں، لیکن صلاحیت بالکل نہیں رکھتے، کیا یہ وُہی لوگ نہیں، جن کی نسبت قرآن حکیم نے بھی کہا:-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا

وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ؕ: "اُن کے سینے میں دل تو ہیں، لیکن محض گوشت کے چند لوتھڑے، کہ بصیرت سے یکسر عاری؛ ان کی آنکھیں تو ہیں، لیکن ایسی کہ چشم نرگس کی طرح کچھ دیکھ نہ سکیں، وُہ کان تو لئے پھرتے ہیں، لیکن اس طرح کہ گویا کچھ سُن نہیں سکتے، پس یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ!

.... ایک پتھر میں تو رقت اور گداز کا مادہ پایا جا سکتا ہے، لیکن ایسے نااہل گویا مٹی کی ایک بے جان مورت ہیں، کہ نہ تو از خود حرکت کر سکیں، اور نہ کوئی دُوسرا ان سے ہمکلام ہو سکے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ؕ: "اے نادانو! پھر لگاتار غافل رہنے سے تمہارے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، کیا تم بہت سے پتھر ایسے نہیں دیکھتے، کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں، وُہ پھٹتے ہیں، اور پھٹنے پر اُن سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے ہر طرف بہ نکلتے ہیں، پھر انہیں میں ایسے پتھر بھی ہیں، جو خوف خداوندی سے بے اختیار مُنہ کے بل گر پڑتے ہیں؛ کیا انہیں دیکھ کر بھی تمہاری چشم بصیرت وا نہیں ہوتی؟" — یاد رکھو کہ خدا تمہاری حرکات و سکنات سے ہر وقت باخبر رہتا ہے!"

کیا نیٹشے نے بھی ایسے ہی کور باطن اور نااہل لوگوں کی نسبت

نہیں کہا تھا کہ :۔ "جو لوگ حکمت کے فیض سے محروم ہوں، انہیں بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ سمجھنا چاہیئے، اے دوست! ان سے کوسوں بھاگ اور انہیں اپنے قریب بھی نہ بھٹکنے دے، اس لئے کہ وہ تیرے دل کو بیمار کر دینگے، وہ گندگی اور غلاظت پر بیٹھنے والی زہریلی مکھیاں ہیں، جو ایک دفعہ چھو جانے سے بھی تجھے مسموم کر کے چھوڑیں گی، بھاگ! بھاگ!! ان کے سائے سے بھی نفرت کر، اسی میں تیرا بچاؤ ہے، انہیں اس خطرناک حالت میں رہنے دے، اور اپنا دامن محفوظ رکھتے ہوئے ان روشن فضاؤں میں پرواز کر جا، جہاں سورج پوری تیزی کے ساتھ چمکتا ہے، ہوائیں پہاڑ کی چوٹیوں سے کھیلتی، اور سر سبز و شاداب وادیوں سے گزرتی ہوئی تجھ تک پہنچتی ہیں، اور جہاں تیرے سر پر بجائے چمگادڑوں یا کبوتروں کے، عقاب اور شکرے ایک حاکمانہ شان سے منڈلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں" گویا :۔

میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک　　ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی

اور اسی ضرورت کو لحاظ رکھتے ہوئے خیامؔ نے بھی کچھ بے جا تو نہیں کہا تھا :۔

با مردم پاک اصل و عاقل آمیز　　وز نا اہلاں ہزار فرسنگ گریز
گر زہر دہد ترا خردمند بنوش　　ور نوش رسد ز دست نا اہل بریز

اور پھر سعدیؔ نے بھی اپنے قول میں کچھ زیادتی تو نہیں کی :۔

ز جاہل گریزندہ چوں تیر باش　　نیامیختہ چوں شکر شیر باش
سر جاہلاں بر سریر دار بہ　　کہ جاہل بخواری گرفتار بہ

آہ ! کیا خوب فرمایا ہے اکبرؔ مرحوم نے بھی :-

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا　　غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن　　کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

—— اگر فی الواقع انسان میں نظر پیدا ہو جائے تو پھر وُہ دیکھے کہ اس کا وجود بھی اک شعر ہے، ارض و سما کی تکوین بھی شعر ہی سے ہوئی ہے، اور پھر ذات خداوندی کو بھی شعر ہی نے بے حجاب کیا ! —— اگر خدا کو ایک شاعر نے مشاہدہ نہیں کیا ہے، تو کیا تم خیال کرتے ہو، کہ وُہ خشک ملّاؤں اور حجرہ نشین صوفیوں کے ہاں جلوہ پیرا ہؤا ہوگا ؟ —— ہرگز نہیں ! دل کی بات دل کے سوا اور کون بتا سکتا ہے :

حدیث عشق و سرمستی ز من بشنو نہ از واعظ　　کہ با جام و سبو ہر شب قرین ماہ و پروینم !

اور پھر :-

راز درُون پردہ ز رندان مست پُرس　　کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را

اور پھر اس سے بھی گذر کر :

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم　　اے بیخبر ز لذّتِ شُربِ مدام ما !

.... پھر مضامین کے اندر جدّت کا پیدا کرنا انسان کا ایک طبعی حق ہے، لیکن اکثر صاحبان کو، جو تقلید کو اپنا وصف امتیازی خیال کرتے ہیں، اس میں بھی قاصر پایا گیا، وہ فرمائیں تو سہی کہ افسردہ خیالات اور دُور از کار مباحث ہی کو دُہراتے چلے جانا، اور موت و حیات کے لاینحل عقدوں میں اپنے آپ کو گم کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے، کیا زندگی اپنی فطری قوتوں ہی سے اپنے حقوق کو

حاصل نہیں کر سکتی تھی، اور کیا وُہ کائنات کی جان ہونے ہوئے بھی اتنی ہی ناکارہ اور کمزور چیز تھی؟ — حیف ہے اس سعی لاحاصل پر، اور صد ہزار افسوس ہے، اس کاوش پر جس کا کوئی مقصد نہ ہو،

آہ! جن لوگوں کو "خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَعَلَّمَہُ الْبَیَانَ: "ہم نے انسان کو پیدا کیا اور حسن بیان کی تمام قوتیں اسے عنایت کردیں"! اور پھر علّم بِالْقَلَمِ، وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ: "ہم نے انسان کی تعلیم و تدریس قلم کے ساتھ کی، اور اُسے وُہ کچھ سکھلا دیا جسے وہ کبھی جانتا ہی نہ تھا" — کا مصداق ہونا چاہیئے تھا، ان کی جلوہ ریزی آج کس نقاب میں ہوتی ہے، اور آنکھیں کیوں اپنے جذب وکشش ہی سے ایسا پیکر بنا کے میرے سامنے کھڑا نہیں کر دیتیں:-

ڈھونڈھے ہے اس مغنّیِ آتش نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

ہاں تو نہیں نہیں، ہم اپنے جذبات کو پژمُردہ کیونکر ہونے دے سکتے ہیں معمولی سوالات عمل کے راستے میں کب حائل ہونے تھے، اور ہم اس مقام پر کائنات کے ارتقائی قانون کو کس لئے فراموش کر دیں؟ — ہوگا! یہاں سب کچھ ہوگا!!! ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوں گی، تلافی کی جائیگی، اور اُمید کی روشن مشعل کو ہاتھ میں لیئے ہوئے دل منزل مقصود کی جانب بڑھیگا،

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

آمدم بر سر مطلب

پس انہیں حالات کے پیش نظر مدت سے یہ خیال تھا، کہ بجائے اس کے کہ اپنے اوقات کو بحث وتمحیص یا افسوس وحسرت ہی میں ضائع کر دیا جائے، ایک ادارۂ ادبیہ کا قیام عمل میں لایا جائے، جس کا مقصد مسلمانوں کے علمی اور ادبی ذوق کی اصلاح کے ساتھ ہی ساتھ انہیں اسلام کے صحیح فلسفہ سے رُوشناس کرانا ہو، لیکن ظاہر ہے کہ اس شاندار مقصد کا افتتاح اسوقت تک بالاستقلال عمل میں نہیں لایا جاسکتا تھا، جب تک کہ بہتر سے بہتر اور عمدہ سے عمدہ کتابوں کا ذخیرہ بذات خود مہیّا نہ کر لیا جاتا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر بغیر اس کے کام کو شروع بھی کر دیا گیا، تو اس کی حیثیت اس سپاہی سے زیادہ نہیں ہو سکتی، جو انتہائی جوش وخروش کے ساتھ میدان کارزار میں کُود پڑے لیکن ہتھیار اُس کے پاس ایک بھی نہ ہو، سو الحمدللہ کہ یہ آرزو بھی، جس شان سے کہ میں چاہتا تھا پُوری ہو لی!

آج میں بے حد مسرُور ہوں کہ **دارُالتّالیف ہند** کی طرف سے پہلی کتاب شائع ہو کر ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے، اس کام کو یہیں تک محدُود نہیں سمجھ لینا چاہیئے، بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ میری تشنگی کے سامنے اس کی حیثیت ایک قطرے کی حیثیت بھی نہیں:۔

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی ۔۔۔ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

اور حق تو یہ ہے کہ:۔

دکھاؤنگا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

ہاں اس ضمن میں معزز ناظرین پر بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جہاں وہ خود اسے ایک ملّی اور اجتماعی خدمت تصوّر کرتے ہوئے ہر ممکن ذریعہ سے اس میں حصّہ لیں، وہاں دوسروں کو بھی اس جانب توجّہ اور رغبت دلانے میں کوئی وقیقہ اٹھا نہ رکھیں! اس کام کی بنا میری ذاتی اغراض پر نہیں ہے، بلکہ یہ زبان کی وُسعت اور بقا کا سوال ہے، اس کا مطمح نظر ادب' اور ادب کے ساتھ اسلامی تہذیب کو طرز جدید کے مطابق از سر نو زندہ کرنا ہے؛ پس اس مقصد کی اہمیّت کو میرا علم دوست طبقہ بذات خود بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے، اس مرکز کو جتنا بھی قوی بنایا جائیگا، اسی قدر کامیابی کے ساتھ ہم اپنے کام کو جاری رکھ سکینگے، سو آئیے اور آج اپنی سلامتیٔ ذوق اور غیرت ملّی کا پورا پورا ثبوت بہم پہنچائیے :-

در رہِ منزل لیلےٰ کہ خطرہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

— اس راہ میں جب تک ایثار اور ہمدردی کا مظاہرہ نہیں کیا جائیگا، کام خاطر خواہ طور پر سر انجام نہیں پا سکتا، یہ تو صاحب ذوق اور صاحب ثروت حضرات کی سرگرمی اور فراخدلی ہی ہے، جو اس متّحد اور مرکوز نظریّہ کو زیادہ سے زیادہ شاندار صُورت میں ہمارے سامنے لا سکتی ہے،

پیش نظر کتاب اسی سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ہے، یہ مسٔلہ کہ میں نے کیوں اسے سب سے مقدّم رکھا، غالب کی شخصیّت اور اس کی موجُودہ ہر دلعزیزی، خود حل کیۓ دیتی ہے، میں بھی اس میخانہ میں ایک پرانا

رند ہوں، جب بھی ضرورت پیش آئی ہے، پیمانۂ و سبو کی جگہ خم کے خم نوش کئے ہیں، اور پھر بھی تسکین نہیں ہوئی ــــــ

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے　　تریاکیٔ قدیم ہوں دُودِ چراغ کا

ساقیٔ ازل نے اسی روز مجھے سب کچھ عنائت کر دیا تھا، جبکہ دوسرے لوگ ابھی مستی کے عالم میں پڑے خراٹے لے رہے تھے ــــــ

فنا آموزِ درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے　　کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

دُوسروں کو جن ذخائر کے لئے تحقیق اور ورق گردانی کی ضرورت پیش آتی ہے، وُہ بفضلہ تعالیٰ یہاں دماغ میں محفوظ، اور نظر کے سامنے پھیلے ہوئے ہیں:

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو باز م نداشت　　دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

میں نے ہمیشہ سے اپنی آنکھوں کو وقفِ گریہ رکھا ہے، قطرے کی جگہ دریا اور دریا کی جگہ سمندر بہا دینے سے بھی دریغ نہیں کیا، اور پھر اسی میں سیرِ دو عالم کے مزے لُوٹے ہیں، مجھے اپنے مرشد کا قول بھی وِردِ زبان ہے:۔

ہے ننگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو　　ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم　　دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ــــ میری بڑھتی ہوئی قوتیں کبھی شرمندہ ساحل نہیں ہوئیں، محض درسی کتابوں یا یونیورسٹی کے مقرر کردہ نصابوں پر میں نے کبھی اکتفا نہیں کیا، اور رسم و رواج کے سفینے اکثر اوقات ایک ایک ٹھوکر میں غرق کر دیئے ہیں، اور ایسے غرق کئے ہیں کہ انکا نام و نشاں بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا، لیکن یہ سب کچھ کیوں ہے؟

— محض اس لئے کہ انسانی عظمت اسی کو چاہتی ہے؛ اخلاق کا یہی تقاضا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غالب بھی بجائے خود اسی مسلک کا انسان تھا، جب وُہ عامیانہ حیثیت میں کسی کی شرکت کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتا تھا تو اس کا ایک سچّا معتقد بھی اس پست اور کمزور تخیل پر کس لئے قانع ہو جاتا، آہ!:—

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں　　پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

اور پھر:—

زبسکہ پیروی خلق گمرہی آرد　　نمی رویم بہ راہے کہ کارواں رفتہ است

پس:—

راہے کہ خضر داشت زسر چشمہ دُور بُود　　لب تشنگی زراہِ دگر بردہ ایم ما

الغرض ایک عمر اسی دشت کی سیّاحی میں بسر کی، دنیائے ادب کا گوشہ گوشہ چھان مارا، ذرّوں میں خورشید کی چمک، اور کانٹوں میں پھُول کی مہک پائی، بلبل کی خوش الحانیاں بھی سنیں، اور کوّے کی سامعہ خراش صدائیں بھی سُننے میں آئیں، طبیعت نے جب کسی خلاف بات پر اکراہ کیا، تو اسے یُوں کہہ کر سمجھا بھی لیا کہ:—

بر اہلِ ذوق در فیض در نمی بندد　　نوائے بُلبُل اگر نیست صوتِ زاغ شنو

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جو رنگینی اور بلاغت مرزا کے کلام میں دیکھی کسی اور کے ہاں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ پایا، اور یہ ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس پر غالب نے خود بھی کہا:—

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے "اندازِ بیاں" اور

پس اس فوقیت کے پیش نظر اوّلاً میں نے چاہا تھا، کہ دیوان ہی کی ایک مکمّل اور مبسُوط شرح طیّار کردُوں، "تاکہ مشرق کی یہ زندہ جاوید ہستی" ابنائے زمان کی غفلت، اور کوتاہی کی بنا پر اپنی اصلی اور حقیقی شان سے محرُوم نہ رہ جائے لیکن پھر خیال ہُوا، کہ اس سے بھی زیادہ احتیاط کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے ابتداءً ایک مقدّمہ لکھ دیا جائے، جس میں غالبؔ کا فلسفہ اور کمالِ فن اپنے ہر ممکن پہلُو کے ساتھ، مخصُوص عنوانات کے ماتحت ناظرین کے مشتاق ہاتھوں تک پہنچ جائے، سو چیز آپ کے سامنے موجود ہے، جس کے لئے میں کسی ذاتی کمال کا مدّعی نہیں ہوں، اور نہ ہی مجھے کسی حیثیّت سے اپنی قابلیّت کا اظہار منظُور ہے، لیکن ساتھ ہی اتنا عرض کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، کہ خدائے ذوالجلال نے اس عاجز سے وقت کی ایک اہم ترین ضرورت کو پُورا کرایا ہے، جس کیلئے اس ذاتِ کبریا کا جتنا بھی شکر بجالایا جائے، اتنا ہی کم ہے، آج یہ چیز جو سامنے آئی ہے، تو وُہی سالہا سال کا پیدا کیا ہُوا جوش تھا، کہ یکا یک ایک جوئے تنویر بن کے میرے خامہ سے بہ نکلا ہے، ایک مہربان دوست کا تقاضا، اسیر مرزا کے الہامی نغموں کا پیدا کیا ہُوا ارتعاش، بس پھر کیا تھا، چند روز کے قلیل عرصہ میں اسے مکمّل کر کے رکھ دیا!

اس کتاب کو فی الحقیقت دو ابواب پر منقسم کیا گیا ہے، پہلے باب کو فن شاعری کے متعلق ایک مختصر اور مجمل تبصرہ خیال کرنا چاہیئے، جو ایک طور پر تعارف کی حیثیّت رکھتا ہے، اور دُوسرا باب خالصتاً مرزا کی شاعری اور اُس کے مباحث پر مشتمل ہے، میں نے اس دوران میں "نفسیّات شعری" کو

خاص طور پر نمایاں کر دیا ہے، سکولوں اور کالجوں کی سائکالوجی سے میں
اس لئے شاکی ہوں، کہ اسمیں دلچسپی یکسر مفقود ہے، دلائل کی کمی سے انسانی
ذوق کو خاطر خواہ طور پر تسکین حاصل نہیں ہوتی، معانی کا جلوہ کہیں بھی دکھائی
نہیں دیتا، پروفیسر بھی "عملی"[1] کی جگہ صرف "نظری"[2] حیثیت پر اکتفا کر لیتے ہیں،
انہیں چاہیئے تھا، کہ طلباء کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، انسانی جذبات کو کسی
قدر گہری نظر سے ملاحظہ فرماتے، اور اس علم میں جو باتیں انہیں ایک طور پر موہوم
اور ناممکن سی معلوم ہونے لگی ہیں، انہیں حتی الوسع "ممکن" کر کے دکھلا دیتے
اس مقصد کی تعمیل زیادہ تر انسان کی قلبی اور دماغی صلاحیت پر موقوف ہے،
اور بہر منتظمین کا فرض ہے، کہ وہ طلباء کی آئندہ زندگی کو شاندار بنانے کے
لئے اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیں!

طلباء اگر بذات خود غور کریں، تو انہیں اس کتاب میں نفسیاتی
حقائق کے باوجود، دلچسپی اور فرحت کے بہت سے اسباب دکھائی دیں گے
جن سے وہ اس علم اور اس علم کے معنوی اور ذوقی کمالات کو بھی کافی حد
تک جان لے سکتے ہیں،

بالآخر بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں، کہ اس ارادہ کی وہ خصوصیات
جن کی سوسائٹی کو اس وقت اشد ضرورت ہے، اور وہ انہیں تا حال
کما حقہ، حاصل نہیں کر سکی، تائید ایزدی سے اتمام کو پہنچ جائیں، تا کہ

---

[1] Practical

[2] Theoretical

فطرت کی وہ نورانی دنیا، جو ہوس کی تاریکیوں سے مملو ہو چکی ہے، صداقت کے احساس، اور محبت کی قدر شناسی سے اپنی شان کو دوبارہ حاصل کر لے، آمین ٭

۱۰۔جنوری ۱۹۳۵ء   طارق



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

مبادیات

غالبؔ مشرق کا ایک نہائت ہی بلند پایہ فلسفی اور ماہر نفسیّات تھا، اُس کا کلام سراپا الہام ہے، زندگی کا کونسا ایسا نغمہ ہے، جو مرزا کے سازِ دل سے اُٹھتا ہُوا دکھائی نہیں دیتا، اور کونسی ایسی دردناک صدا ہے جو فضائے آسمانی میں گونجتی ہوئی سنائی نہیں دیتی، مرزا کا پیغام حقیقت میں رُوح القدس کا پیغام ہے!' .... لیکن قبل ازیں کہ ہم اس پیغام کو تفصیلی رنگ میں ناظرین کے سامنے پیش کریں، خود علم النفس، شعر کی ماہیّت، دونوں چیزوں کا باہمی ربط وضبط اور شاعری کے لوازمات پر ایک سیرحاصل تبصرہ ہوجانا چاہیئے' ورنہ اس کے بغیر دیوان غالبؔ کی شرح اور خود وہ بحث بھی جو مرزا کے خصوصیّاتِ کلام پر آئندہ کی جانے والی ہے' ایک طور پر ناقص اور تشنہ سی رہ جائے گی:۔

علم النفس علم النفس کا کام کسی چیز کے حقیقی اور فطری اسباب وعوامل

کو صحیح اور غیر مشکوک طور پر معلوم کرنا ہے، بہت ممکن ہو سکتا ہے، کہ ایک معمولی سمجھ کا انسان کسی واقعہ سے متاثر ہو کر محض اس کے ظاہری وجوہ پر قناعت کر لے، اور اس کی کم نظری یا کور ذوقی اس مُبہم اور نا معلوم کیفیت سے اس کے دل و دماغ کو محروم رکھے، جو ایک شاعر فطرت اور ماہر نفسیات کا حصہ ہُوا کرتا ہے: مثال کے طور پر چونکہ غالبؔ کے کلام سے بہتر نمونہ اس مقصد کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے دو ایک شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو:

شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا میرے بعد　　شمع بجھتی ہی تو اسمیں سے دھُواں اٹھتا ہے

کون نہیں جانتا، کہ شمع کے بجھتے وقت اسمیں سے دھُواں اُٹھا کرتا ہے ہم تم اس حالت کو روزمرّہ دیکھتے ہیں، اور بظاہر اسمیں کوئی خاص بات نہیں پاتے، لیکن شاعر کی نگاہ حقیقت رس اسی معمولی واقعہ سے ایک ایسا مضمون اخذ کرتی ہے، جو سوز و اثر کے لحاظ سے اپنی تمام معنوی کیفیّات کو حاوی ہے!

ہم سے کوئی اس کی علّت دریافت کرے، تو زیادہ سے زیادہ اتنا بتلا سکیں گے، کہ شمع بجھ جانے کے بعد چونکہ اس کا فتیلہ تھوڑی دیر کے لئے جلتا رہتا ہے، اس لئے دھوئیں کا اٹھنا لازمی ہے، ...... لیکن شاعر اپنی بلند نظری سے اس کی وجہ یہ بتلائیگا، کہ عشق کو جس شان و احترام سے ہم نے اپنے دل میں جگہ دی تھی، اس طرح امید نہیں، کہ ہمارے مرنے کے بعد کوئی دُوسرا شخص بھی یہ حق بجا لا سکے، پس شعلۂ عشق اسی غم میں دھوئیں کی مثل ایک ماتمی لباس زیبِ تن کئے ہے، گویا:

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

اسی طرح ایک اور مثال لیجئے :

ثابت ہُوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھکر

عام نظروں میں صراحی کے اندر شراب کا لرزنا اور تھرتھرانا کچھ بھی وجہ رکھتا ہو، لیکن ایک فلسفی کا دماغ یہاں بھی ایک ایسا نتیجہ اخذ کریگا، جو نفسیاتی اعتبار سے ایک بہترین نتیجہ ہو، اور پھر غزلیت کا رنگ بھی فوت ہونے نہ پائے .... اس واقعہ کا اس سے زیادہ لطیف اور نازک سبب اور کیا ہو سکتا ہے کہ محبوب نے ضرورت سے زیادہ شراب پی لی ہے، اور اس وجہ سے وہ لڑکھڑاتا ہُوا چلا جاتا ہے،

حسینوں کی رفتار بجائے خود ایک قیامت ہے، پھر شراب کا نشہ ایک قہرِ مزید؛ پس ایسی حالت میں کتنے دل خوُن نہ ہو گئے ہونگے، تو موج شراب صراحی کے اندر اس خوف سے تھرتھرا رہی ہے، کہ اتنے لوگوں کا خون چونکہ اسی کے سبب سے ہُوا، لہذا نہیں معلوم کہ اس جرُم کی پاداش میں اس کے ساتھ کونسا سلوک روا رکھا جائے، گویا :

ہے ایک خلق کا خون سر پہ اشک خوں کے مرے
سکھا دی چال اسے دامن اُٹھا کے آنے کی (مومن)

اب ناظرین خود اندازہ فرمائیں، کہ ایک عام شخص اور فلسفی کے نقطۂ نگاہ میں کتنا فرق ہُوا کرتا ہے ؏

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ایک اشیاء کو اُن کی ظاہری صُورت سے جانچتا ہے، تو دوسرا اُن کے حقیقی اور نفسیاتی اسباب و وُجوہ معلوم کرنے کی فکر میں ہے، ایک کسی اہم سے اہم اور عجیب سے عجیب چیز کو بھی سطحی نظر سے دیکھ جاتا ہے، تو دوسرا ایک معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر شئے کو بھی تعمق اور گہرائی کی نظر سے دیکھتا ہے، یہ ہے فرق ایک عام اور خاص حالت کا اور یہی ہے وُہ اصُول جس پر علم النفس کے تمام چھوٹے بڑے مباحث کی بنائیں استوار ہوتی ہیں!

شعر کی ماہیّت اور شاعری کے لوازمات

فلسفہ اور شعر کا باہمی ربط سمجھ لینے کے بعد یہ امر واضح ہو جانا چاہیئے، کہ شاعری کا ملکہ بھی ایک فطری اور وہبی چیز ہے، جس میں ذاتی کوشش کو بہت کم دخل ہے، مان لیا کہ ایک شخص عرصۂ دراز کی محنت اور کدّ و کاوش سے چند متداول بحریں یاد کر لیتا ہے، علم عروض، علم بیان، اور علم بدیع وغیرہ کے چند ضروری اور اہم مسائل بھی اسے ضبط ہو چکے ہیں، لیکن شاعری محض انہیں چند قواعد سے عبارت نہیں ہے، شاعر اپنے سامنے ہر قسم کے ہتھیار بکھرے ہوئے دیکھتا ہے، لیکن یہ تمام ہتھیار اس وقت تک بالکل بیکار اور زنگ آلوُد ہیں، جب تک آسمانی تجلّیات اور فطری تاثّرات کا صیقل انہیں صاف اور روشن کر کے استعمال کے قابل نہ بنا دے، شاعری حقیقت میں خدا کی ایک پاک اور برگزیدہ امانت ہے، کہ اس کے اہل بھی خاص خاص لوگ ہُوا کرتے ہیں، جھُوٹے مدّعی اور نام کے شاعر اس وقت بہت

پیدا ہو جائیں گے، لیکن محض ان کا یہ دعوٰی ہی سچائی کی دلیل نہیں بن سکتا:

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰنِ ایک بیّن اور ناقابل انکار حقیقت ہے، اور اسمیں بھی شک نہیں کہ ع شاعری جزویست از پیغمبری....
اس فن شریف کی پاکیزگی اور تقدّس کو اس سے بھی زیادہ لطیف اور نازک انداز میں سمجھنا چاہتے ہو تو ان تین الفاظ پر غور کرو: شعر، عرش اور شرع۔ یہ الفاظ اگرچہ شکل وصورت اور مفہوم کے لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن مقاصد کے لحاظ سے تینوں کے تینوں ایک ہی وجدانی کیفیت کے حامل ہیں، ش، ع اور ر مادہ ان سب کا ایک ہے، شعر کا اصلی مقام سدرۃ المنتہٰی سے بھی پرے عرش کا مقام ہے، جہاں سے وہ شاعر فطرت کے درد بھرے دل پر نزول کرتا ہے، پھر وہ شاعر انہیں تاثرات کو لے کر ایک موزون صورت میں قوم کے لئے سامان حیات فراہم کرتا ہے! ..... لیکن وہ شاعر جو اپنے اندر ایسی شان پیدا کرنا چاہے، جسے "پیغمبری" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک ایسا انسان ہونا چاہیئے، جو قدرت کی بہار کا دل کھول کر تماشا کرنے والا ہو، قوموں کی تاریخ ہر لمحہ عبرت کا ایک نیا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کرے، حقیقت میں شاعری کی تکمیل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ کائناتِ قدرت کا وسیع اور غیر محدود طور پر معائنہ نہ کیا جائے، یہ ایک ایسا لطیف اور مسرت بخش احساس ہے، کہ جس کی تکمیل سے

مُردہ دلوں کے اندر بھی زندگی کی ایک برقی رو دوڑ جاتی ہے، اور ایسی حالت میں ہر مشاہدہ وُہ کیفیت پیدا کرتا ہے، جو ایک سچّے شاعر کے لئے سزاوار ہے۔ ... کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرنا بیشک ایک مستحسن فعل ہے، لیکن اس فعل سے طبیعت میں جو تکان اور افسردگی سی پیدا ہو جایا کرتی ہے، اس کا ازالہ بھی سیر و تفریح کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں کر سکتی؛ دَوران مطالعہ میں بعض باتیں انسانی ذہن کے اندر ایسی ناقص اور مشتبہ رہجاتی ہیں، کہ انہیں قدرت کا وسیع اور بے دریغ فیضان ہی یقین اور اطمینان سے بدل سکتا ہے، تو گویا بقول اقبالؔ:-

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اسکی نمود　　گُل کی پتی میں نظر آتا ہو رازِ ہست و بُود

اور پھر قدرت کی بہار بجائے خود اس قدر بے پایاں ہے، کہ انسان ہی اُسے تماشا کرتے کرتے تھک جائے، تو تھک جائے، وُہ ختم ہونے میں نہیں آتی میر انیسؔ فرماتے ہیں:

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں　　یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے　　حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

یہی وجہ ہے، کہ دُنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں، وہ قُدرت کی نیرنگیوں کا دل کھول کر تماشا کیا کرتے تھے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ　　چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

— روئے زمین پر بسنے والے انسانی قبائل، اور اُن کے مختلف عادات و اطوار اور عجیب و غریب خصائل کو دیکھتے تھے، کہیں دامن کوہ میں پھیلے

ہوئے خودرو پھول ان کے دلوں میں حیات تازہ پیدا کرتے ہیں، تو کہیں لہلہاتے ہوئے سبزہ زار اُن کی رُوح کو جذب کئے لیتے ہیں، کہیں ننھے ننھے پرندوں کے لطیف اور پرسوز نغمے ان کے پہلو میں گدگدی پیدا کرتے ہیں، تو کہیں چشمے کی شورشوں میں وُہ آسمانی الوہیت کا پرسکون پیغام گوش دل سے بیٹھے سُنا کرتے ہیں؛ شیکسپیر کو دیکھئے کہ باتوں باتوں میں انسانی فطرت کے وُہ وُہ دقیق نکات بیان کر جاتا ہے، کہ گویا یہ بھی ایک پہلے ہی سے جانی بوجھی بات تھی، ملٹن کی شہرۂ آفاق نظم "گمشدہ بہشت" ہی کو دیکھ جائیے کہ اسمیں حقیقت اور فطرت کی کیا کیا نیرنگیاں دکھائی دیتی ہیں، .... اسی طرح شیلے بھی اگر کائنات کو کسی قدر گہری نظر سے نہ دیکھتا، تو اس کا "فلسفۂ محبّت" اور فلسفۂ رُوح جسے وہ اپنی غیر فانی نظم "سکائی لارک" میں مختلف تشبیہات اور استعارات سے حل کرتا ہے، اسقدر مقبول اور کامیاب ثابت نہ ہوتیں، سَر والٹر سکاٹ اپنی نظموں میں جس خوبی سے مناظرِ قدرت یا تاریخی کھنڈرات کو پیش کرتا ہے وُہ کوئی نئی چیز نہیں ہے؛ گویا واقعات اور حالات کا ایک سماں آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے، چنانچہ اس کی نسبت بھی نقل کیا گیا ہے، کہ جب اس کے ایک دوست نے چھوٹے چھوٹے پھول اور پتیوں پر بھی اُسی پاکٹ بک میں خاص خاص باتیں نوٹ کرتے ہوئے دیکھا، تو کہا کہ "اس دردِسر سے کیا فائدہ؟ کیا عام پھول کافی نہ تھے، جو چھوٹے چھوٹے پھولوں کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت پڑی" سر والٹر نے جواب میں کہا، کہ

تمام کائنات میں دو چیزیں بھی ایسی نہیں ہیں، جنہیں بالکل یکساں کہا جا سکے۔"

بخلاف اس کے ایک طبقہ شعراء کا ایسا بھی ہے، جن کی تمام جولانیاں فحش اور ہزلیات ہی تک محدود ہیں، فریڈرک نیٹشے جرمنی کا مشہور فلاسفر اور "فوق الانسان" کا معلّم اپنی کتاب "بقول زرتشت" میں ایسے لوگوں کی نسبت بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"میں شعراء سے تنگ ہوں، قدیم شعراء سے اور جدید سے، وہ سب پایاب پانی میں ہیں، ان کی مثال خشک دریاؤں کی سی ہے، ان کا تخیّل تعمّق سے خالی ہے، ان کے احساسات سطحی ہیں، تعیّش اور رندی کے چند جذبات کے سوا ان کے دیوانوں میں کچھ نہیں۔"

"تلقین و استدراک" کے ان چند ابتدائی جملوں کے بعد اب ان اہم اور ضروری مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے، جو شاعری کے لئے ایک طور پر زیورات کا کام دیتے ہیں:-

فصاحت ان میں سب سے پہلی اور مقدّم چیز فصاحت ہے، فصاحت کے معنی یہ ہیں، کہ کلام میں الفاظ اور فقرات کی ترتیب کا اس طور پر لحاظ رکھا جائے، کہ ترکیب میں کسی طرح کی ثقالت پیدا نہ ہو، جواہرات خواہ کتنے ہی خوبصورت اور بیش بہا کیوں نہ ہوں، لیکن انہیں بھی اگر ایک خاص ترتیب سے مناسب صورت میں منسلک نہیں کیا جاتا ہے، تو وہ بھی بدنما اور بھونڈے سے معلوم ہونے لگیں گے؛ پس ایک انشاءپرداز کے لئے

الفاظ کا معاملہ ہیرے اور جواہرات سے بھی کہیں زیادہ احتیاط کے قابل ہے، بعض اوقات ایک معمولی سی فروگذاشت پر ایک پورا فقرہ، بلکہ سارے کا سارا بیان فصاحت کے مرتبے سے گر جاتا ہے!

فصاحت حقیقت میں ایک خداداد ملکہ ہے، اور اس کا صحیح امتیاز بھی ذوق سلیم کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ممکن نہیں، کلام میں فصاحت اور روانی پیدا کرنے کے لئے الفاظ نہائت مانوس، دلپسند، اور شیریں لانے چاہئیں، کہ نہ تو اُن کے تلفّظ میں زبان کو کسی طرح کی رکاوٹ اور دقت پیش آئے، اور نہ کانوں پر ان کا سُننا اور لذت یاب ہونا کسی قسم کی گرانی یا کراہیت کا موجب ہو، بلکہ ان میں ایک ایسا سلیقہ پیدا کیا جائے، کہ سامعین پہلے ہی سے انہیں سننے کے لئے خود کو آمادہ اور مشتاق پائیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہم ذیل میں چند مثالیں نقل کر کے اپنے بیان کو واضح کئے دیتے ہیں،

میر انیس کا ایک مصرعہ ہے ؏

فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور

اس جگہ صحرا کا لفظ نہائت موزون طور پر مستعمل ہؤا ہے، اور بجائے خود فصیح بھی ہے، لیکن اس کی جگہ اسی کا ایک ہم معنی لفظ یعنی جنگل چسپاں کر دیا جائے، تو فصاحت خاک میں مل جائے گی، اور ترکیب کی لطافت ہاتھ سے جاتی رہے گی!

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

طائر ہُوا میں مست ہرن سبزہ زار میں   جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کا لفظ ایسا نگینہ سا جڑ دیا گیا ہے، کہ اس کی جگہ صحرا کا لفظ نہائت بھونڈا اور ناگوار معلوم ہوگا، اسی طرح ایک اور مثال ملاحظہ ہو :

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہُوا   تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہُوا

یہاں اوس کا لفظ نہائت قرینے سے چسپاں کیا گیا ہے، لیکن اسی کی جگہ اس کا ہم معنی اور مرادف لفظ یعنی شبنم لگا دینے سے عبارت کی سلاست اور بیان کی روانی خاک میں مل جائیگی، اور دُوسری جگہ ع

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

شبنم کی جگہ اوس کا لفظ لانے سے فصاحت مفقود ہو جائے گی ،

میرزا دبیر کا ایک شعر ہے :

مثل تنور گرم تھا پانی پہ ہر حباب   ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب

میر انیس فرماتے ہیں :

پانی تھا آگ گرمئ روز حساب تھی   ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اب ان اشعار کو بغور ملاحظہ فرمائیے، مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے، لیکن پہلے شعر میں یہ مفہوم کسی قدر بھونڈے الفاظ، اور بھدّے پیرائے میں ادا کیا گیا ہے، اور دُوسری مثال میں اسی نقص کے رفع ہو جانے سے بیان میں روانی اور روانی کے ساتھ فصاحت پیدا ہو گئی ہے !

پھر ع

کس نے نہ دی انگوٹھی رکوُع و سجوُد میں   (دبیرؔ)

میر انیسؔ فرماتے ہیں:

سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

ایک ہی واقعہ ہے، اور دونوں نے ایک ہی روائت کو نظم بھی کیا ہے، لیکن دُوسری مثال میں محض الفاظ کی موزونیت نے ترکیب میں کتنی موسیقی پیدا کر دی!

اسی طرح ع

جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحبِ مکاں   (دبیرؔ)

میر انیسؔ ع

جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے

یہاں بھی وہی شان دیکھ لیجئے، کہ پہلے مصرع میں گویا الفاظ ایک دُوسرے سے رُوٹھے ہوئے اپنا اپنا دامن بچائے بیٹھے ہیں، اور دُوسرے مصرع میں آبدار موتیوں کی مثل یکے بعد دیگرے ڈھلکتے چلے آتے ہیں!

اس ضمن میں **روزمرّہ** اور **محاورہ** کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے، اور یہ اس لئے کہ کلام جس قدر بھی روزمرّہ اور محاورہ کے مطابق صحیح اور مستند طور پر ڈھلا ہوُا ہوگا، اسی قدر فصاحت اور لطافت میں بھی بے مثل ہوگا، اسی طرح سے جتنا بھی روزمرّہ سے دور ہوگا، اُسی قدر فصاحت کے معیار سے بھی گر جائیگا، مثال کے طور پر غالبؔ کا یہ شعر لیجئے:

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق   پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وُہ پا جائے ہے

شعر بہت اچھا ہے، اور بجائے خود ایک خاص کیفیّت کا حامل ہے،
لیکن اسی خیال پر **مومنؔ** کا انداز بھی ملاحظہ ہو:

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چُرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

یہاں صرف محاورات ہی کے مناسب استعمال سے شعر میں فصاحت اور روانی پیدا ہوگئی ہے، اور غالبؔ کا شعر اس کے بالمقابل ماند پڑ گیا ہے؛ آنکھیں چرانا، کھویا جانا اور پھر اغیار کا پا جانا، ایسی خوبی اور تسلسل سے چسپاں ہوئے ہیں، کہ اس کی نظیر نہیں! اسی طرح غالبؔ کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

ترے سروِ قامت سے اک قدِّ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

یہ بھی ایک اچھا خیال ہے، اور مناسب طریق پر ادا بھی کیا گیا ہے، لیکن **میر ممنون** کے ہاں یہی خیال اس طور پر باندھا گیا ہے:

تفاوت قامتِ یار اور قیامت میں ہے کیا ممنوںؔ
وُہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

اس شعر میں روزمرہ کے التزام، اور الفاظ کی بے ساختگی اور گھلاوٹ نے مضمون کو زمین سے اُٹھا آسمان تک پہنچا دیا ہے، بلکہ معنوی لحاظ سے بھی غور کیا جائے، تو دُوسرا شعر پہلے شعر سے بمراتب بلند ہے، اوّل تو فتنۂ قیامت ہی کیا کم فتنہ تھا، مزید براں اس کا سانچے میں ڈھل جانا کیا کچھ قیامت برپا نہیں کریگا!

پس اس بحث سے یہ بھی معلوم ہو چکا، کہ روزمرّہ اور محاورہ کا صحیح اور

مناسب استعمال بھی فصاحت کے لیئے کافی حد تک معین ثابت ہوتا ہے، اور اس سے بھی کلام میں ایک طرح کی لچک اور موسیقی پیدا ہوجاتی ہے،

فصاحت کے موضوع پر ہم ایک دفعہ پھر اس حقیقت کا اعادہ کیئے دیتے ہیں، کہ اس میں جس قدر بھی الفاظ اور فقرات کی تہذیب و ترتیب کا لحاظ رکھا جائیگا، اُسی قدر بیان میں روانی اور انداز میں جدّت پیدا ہوگی، اور اس کا خلاف کرنے میں نقصان، تو گویا جس طرح ایک شاعر نے اپنی طرز میں زندگی اور موت کی حقیقت اس طور پر بیان کی کہ:

زندگی کیا ہی عناصر میں ظہور ترتیب ۔۔۔ موت کیا ہی انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اسی طرح سمجھ لیجئے، کہ فصاحت کیا ہے؟ اجزائے کلام میں حسُن ترتیب ہے، اور انہیں اجزاء کا پریشان ہونا فقدانِ فصاحت ہے!

بلاغت فصاحت کے ساتھ بلاغت بھی ایک لازمی اور ضروری امر ہے، اگر فصاحت کا خاصّہ یہ ہے، کہ وُہ کلام میں لطافت اور روانی پیدا کردیتی ہے، تو بلاغت کی یہ شان ہوگی، کہ وہ اس کلام کو معنوی نقائص سے بھی پاک کردے، بلاغت واقعات کو ایسی صُورت میں ظاہر کرنا ہے، جیسے کہ وہ فی الحقیقت ہیں، مثلاً ہم کسی مرد دانا سے چند ایسے الفاظ اور جُملے کہلوائیں، جن کی توقع کسی بازاری آدمی سے ہو سکتی ہے، یا کسی بچّے کی زبان سے ایسی باتیں نقل کریں، جو ایک مدبّر اور دانشمند کے لیئے سزاوار ہیں، تو اسے بلاغت نہیں کہا جائیگا۔۔۔۔ یا مثلاً کسی شخص کو،

جو ایک بات سے قطعی طور پر منکر ہے، سادہ اور معمولی الفاظ میں قائل کرنا، یا ایک ایسی بات کے لئے جس کو وہ پہلے ہی سے تسلیم کئے ہوئے ہے، اُس کے روبرو قسم کھاکر اسے یقین دلانا، شان بلاغت کے خلاف ہوگا؛ پس بلاغت کا کام ہر چیز اور ہر واقعہ کو اس کی اصلی حالت، اور پوزیشن پر ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا ہے، اور پھر یہ ایک ایسا نازک اور دشوار کام ہے، کہ بڑے بڑے اہل قلم بھی یہاں ٹھوکر کھا جایا کرتے ہیں،

واقعات کا صحیح چربہ بھی نہیں اُتر سکتا، تاوقتیکہ الفاظ بھی ایسے موزوں اختیار نہ کئے جائیں، جو اس خاص واقعہ یا حالت سے پورا پورا ربط رکھتے ہوں، شاعر کے سامنے بیان کرنے کے لئے مختلف اوقات میں مختلف مضامین ہوا کرتے ہیں، لیکن جب تک ہر مضمون کی نوعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب الفاظ استعمال میں نہ لائے جائیں، کلام میں نہ تو اثر پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ وہ بلاغت کے معیار پر پورا اُترتا ہے، پھر الفاظ کا صحیح اندازہ قائم کرنا بجائے خود ایک مستقل فن ہے، اور اس فن کے قواعد وضوابط سراسر وجدان اور ذوقِ سلیم پر مبنی ہیں، بعض الفاظ تو صرف اپنی شکل وہیئت ہی سے اپنے معانی کے مظہر ہوا کرتے ہیں، بعض سے خوف وہراس ٹپکتا ہے، کہ ان کے دیکھتے ہی انسان پر ہیبت چھا جاتی ہے بعض سے تعجب کا اظہار ہوتا ہے، اور بعض سے افسوس اور حسرت کا، اسی طرح بعض سے مسرت اور بشاشت ٹپکتی ہے، کہ انہیں پڑھتے ہی رُوح کی تمام کلفتیں زائل ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ غزل میں سادہ،

شیریں، سہل اور لطیف الفاظ کا استعمال مستحسن سمجھا جاتا ہے، اور قصیدہ میں زوردار الفاظ کا؛ اسی طرح رزم، بزم، مدح و ذم، فخر و ادّعا اور وعظ و پند وغیرہ میں ہر مضمون کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، اور ان الفاظ کو احتیاط اور قرینے سے استعمال میں لانا ہی بلاغت میں ایک شان پیدا کرنا ہے!

مثال کے طور پر "خیالستان" مصنفہ سجّاد حیدر کے یہ چند فقرات ہی لے لیجئے:-

(۱) تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اس کی طرف گیا،

(۲) ادہر سلسبیل قمر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی،

(۳) بڈھا رواں بادلوں پر نظر گاڑ کر سوال کا جواب دیتا،

(۴) اس آواز میں ایک عزم آہنین کی قوّت، ایک حکم عدالت کی مہابت موجود تھی،

(۵) اس کے دل میں ایک طغیان غرور اُٹھا،

(۶) جس کی ہیئت کذائی سے بوئے فحش کے بھپکے نکل رہے تھے،

(۷) دو آنسو کے قطرے، دو قطرۂ سعادت ڈھلک رہے تھے،

(۸) ان سب چیزوں کو لرزش حیات دینے والی موم بتّی تھی، جس سے مختصر سی روشنی نکل رہی تھی،

(۹) وُہ شفقت و رقت، روحانیت و انسانیت کی دیوی ماں،

خط کشیدہ الفاظ کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے، ہر جگہ واقعہ اور حالت

کے مطابق جذبات اور کیفیات کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے الفاظ کو استعمال میں لایا گیا ہے، یہی وجہ ہے، کہ ہر فقرے کے ساتھ معانی کا لطیف احساس بھی فوراً انسان کی طبیعت پر چھا جاتا ہے!

اُردو شعراء میں دیکھا جائے، تو میر انیسؔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ محتاط دکھائی دیتے ہیں، دیکھئے صبح کی تصویر کن الفاظ میں کھینچی ہے کہ ایک سماں آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے :-

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح ہر سُو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے رُوئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

خورشید نے جو رُخ سے اُٹھائی نقابِ شب در کھل گیا سحر کا ہُوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حسابِ شب دفتر کشائے صبح نے اُلٹی کتابِ شب

گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہُوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہُوا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے نہاں چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں مُرجھا کے رہ گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور یادِ خدا میں زمزمہ پردازیٔ طیور

وُہ رونق اور وُہ سرو ہوا، وُہ فضا وُہ نُور ٭ خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وُہ سُرخی شفق کی اِدھر چرخ پہ بہار ٭ وُہ بادہ و درخت وُہ صحرا وُہ سبزہ زار
شبنم کے وُہ گلوں پہ گہرہائے آبدار ٭ پھولوں سے سب بھرا ہُوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وُہ گلوں کے شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وُہ جھونکے نسیم کے

تھی دشتِ کربلا کی زمیں رشکِ آسماں ٭ تھا دُور دُور تک شبِ مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذروں پہ تھا گماں ٭ نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
سرسبز جو درخت تھا وُہ نخلِ طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نُور تھا

ایک اور جگہ :

پھُولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح ٭ گلزارِ شب خزاں ہُوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح ٭ سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے پھول جیسے چمن میں گلاب کا

چلنا وُہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم ٭ مُرغانِ باغ کی وُہ خوش الحانیاں بہم
وُہ آب و تابِ نہر وُہ موجوں کا پیچ و خم ٭ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہُوا

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہُوا

وُہ نُورِ صبح اور وُہ صحرا وہ سبزہ زار   تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار   کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سُو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وُہ آفتاب کی وُہ صبح کا سماں   تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤسِ آسماں
ذرّوں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں   نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں

ہر نخل پر ضیائے سرکوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نُور تھی

وُہ پھولنا شفق کا وُہ مینائے لاجورد   مخمل سی وُہ گیا وُہ گُل سبز و سُرخ و زرد
رکھتی تھی پھُونک کر قدم اپنا ہوائے سرد   یہ خوف تھا کہ دامنِ گُل پر پڑے نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

یہ چُونکہ صُبح کی بہار کا ذکر تھا، اس لئے شاعر نے پیرایہ بھی ایسا اختیار کیا ہے، کہ پڑھنے سے طبیعت میں فرحت اور تازگی پیدا ہو، اسی طرح جو الفاظ اس ضمن میں لائے گئے ہیں، وُہ بھی نہایت لطیف اور نرم و نازک الفاظ ہیں، کہ جوُں جوُں پڑھتے جاؤ، توُں توں طبیعت کی افسردگی زائل ہوتی چلی جاتی ہے!

آئیے کہ اب سکون و اطمینان کے ساتھ ہی ساتھ جذباتی دنیا کو بھی

ایک نظر دیکھ لیں، لڑائی کی تیاری ہے، صفیں آراستہ ہو چکی ہیں، گھوڑے آگے بڑھنے کے لئے مضطرب ہیں، اور تلواریں بے نیام ہوا چاہتی ہیں:

نقارۂ دغا پہ لگی چوٹ یک بیک　　اُٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک　　قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شورِ دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیٔ نبرد　　گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخ چارمیں پہ رُخِ آفتاب زرد　　ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجوم فوج سے دہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخ لاجورد　　مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اُٹھ کر زمیں سی بیٹھ گئی زلزلیں گرد　　تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوا سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے "الحذر"　　دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے
لوٹ گیا زمیں کا طبق آسمان سے

تھر تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد　　ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا وادیٔ نبرد

تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد، اور زمیں بھی زرد　　خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا میں گرد

اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں

ٹاپوں پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں

بھلا خوف و دہشت کی اس سے زیادہ مؤثر صورت اور کیا ہوگی، کہ

ع　مُردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

اور انتہا یہ ہے، کہ ع

شیر اس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

اس کے بعد دو حریفوں کی معرکہ آرائی اور فنونِ جنگ کا ملاحظہ بھی فرما لیجئے :-

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی زکال　　چمکی انی تو برق پکاری کہ "الاماں"

اک بندیا ندھ کر جو فرس سے کہا کہ "ہاں"　　ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں

بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا

غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر　　قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر

دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر　　جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر

نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا

دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب　　قبضہ میں لی کمان کیانی بصد غضب

چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب　　تیور چڑھائے قاسم نوشاہ نے بھی تب

تیرِ نگاہ سے وُہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اُتر گیا

ان اشعار میں اوّل سے لے کر آخر تک جتنے بھی الفاظ آئے ہیں، ان سب سے ہیبت، دبدبہ، اور خوف و ہراس ٹپکتا ہے، قہر و جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اور خوُن رگوں کے اندر جوش مارنے لگتا ہے، .... اسی طرح جہاں غیظ و غضب کا اظہار فرماتے ہیں، تو لکھتے ہیں:

کم نعرۂ ہمہمہ اسدِ کردگار سے | نکلا ڈکارتا ہُوا ضیغم کچھار سے
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو | سب دشت گونجتا ہے یہ غصّہ ہے شیر کو

اسی طرح جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، الفاظ ہی واقعہ نگاری کے حق کو بھی صحیح طور پر ادا کیا کرتے ہیں، اس بنا پر میرزا دبیر کا یہ مصرعہ ملاحظہ فرمائیے: ع

فرمایا میں حسین علیہ السّلام ہُوں

یہ اس وقت کا ذکر ہے، جبکہ تمام ہمراہی ساتھ چھوڑ چھوڑ کر یزید کی طرف جا ملے ہیں، اور سوائے خدا کے کوئی یار و مددگار باقی نہیں رہا، تو اس اثنا میں ایک مسافر وہاں سے گذرتا ہے، اور آپ کو پریشان حال دیکھ کر نام دریافت کرتا ہے، میر انیس نے اسی واقعہ کو یُوں ظاہر کیا ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہُوں | مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہُوں

اب آپ ہی اندازہ فرمایئے، کہ بلاغت کے مقتضیات کو میر انیس نے

کس قدر ملحوظ رکھا ہے، اور دبیر کے ہاں یہ لوازمات کِس حد تک مفقود ہیں، اوّل تو کوئی شخص جب وُہ خود اپنا نام بتائے، اس پر کسی زائد چیز کا اضافہ ہی نہیں کیا کرتا ہے، اور پھر امام حسینؑ جیسی برگزیدہ ہستی، جس کا ذکر تیرہ سو سال گذر جانے پر بھی آج تک زندہ چلا آتا ہے، اور تا قیامت زندہ رہیگا اپنے لئے کسی زائد تشریح کی محتاج بھی کیونکر ہو سکتی تھی؛ بخلاف اس کے میر انیسؔ نے واقعہ کا حق ادا کر دیا ہے، اوّل تو ادب کا جو تقاضا تھا، اس کو زیادہ سے زیادہ احترام کے ساتھ اپنے الفاظ میں یُوں ادا کر دیا ع

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہُوں

پھر حالات کے نا مساعد ہونے سے انسان کی جو کیفیت ممکن ہو سکتی ہے اُس کا نقشہ یُوں کھینچ دیا ع

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہُوں

"سر کا جھکانا" بے بسی اور لاچاری کو ظاہر کرتا ہے، جو حقیقت میں اس واقعہ کا زبردست ایکٹ ہے،

اسی طرح ایک اور مثال لے لیجئے:

رُوکش خدا کی فوج سی چھوٹے بڑے ہوئے ۔۔۔ سجّادہ سی امام زمن اُٹھ کھڑے ہوئے

(دبیر)

میر انیسؔ فرماتے ہیں:-

روکش خدا کی فوج سے چھوٹے بڑے ہوئے ۔۔۔ تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

ایک ہنگامہ خیز جنگ ہونیوالی ہے، لیکن میرزا دبیرؔ اس کے لئے صرف امام حسین علیہ السّلام کی تخصیص ظاہر کرتے ہیں، بخلاف اس کے جب میر انیسؔ

کی باری آئی، تو انہوں نے فرمایا ؏

"تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے"

یہاں اپنے امام اور مقتداء کے لئے متبعین کی طرف سے نہ صرف سچی جاں نثاری کا اظہار کیا گیا ہے، بلکہ محاکات کی رُو سے بھی دیکھئے، تو اس خاص منظر کو جس لطیف اور دل کش صُورت میں پیش کیا گیا ہے، اسکی نظیر نہیں! پس معلوم ہؤا، کہ بلاغت کے لئے واقعات کی صحیح اور سچی تصویر کھینچنا سب سے مقدّم امر ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ مضامین کی نوعیّت کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے الفاظ کا مناسب ذخیرہ مہیّا نہ کرلیا جائے، علامۂ اقبالؒ نے ایک جگہ اسی بار یک نکتے کا حل فرمایا ہے، وُہ کہتے ہیں:

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبّت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بنکے سیلِ تندرو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

فطرتِ انسانی کی یہی تقسیم اور نفسیّات کے یہی باطنی خصائص ہیں، کہ جن کی بنا پر فردوسی سے بزم اور سعدی سے رزم کا حق ادا نہ ہو سکا، میر قصیدہ نہ کہہ سکے، اور سودا سے غزل میں وُہ سوز و اثر پیدا نہ ہؤا، جو میرؔ کے ہاں موجُود ہے!

شعر کی ماہیّت اس کے بعد یہاں شعر کی چند ضروری صفات بھی اجمالی طور پر آپ حضرات کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں، مِلٹن کی رائے میں شعر کی خوبی یہ ہے کہ: "سادہ ہو، جوش سے بھرا ہؤا ہو، اور اصلیت پر

مبنی ہو"

تو گویا ملٹن نے شعر کے لئے تین شرطیں قرار دی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، کہ ان میں سے ایک شرط یعنی شعر کا جوش اور اثر سے بھرا ہونا، بلا تامل قبول کر لینے کے لائق ہے، لیکن سادگی اور اصلیت میں ہمیں کلام ہے، ہو سکتا ہے، کہ ایک شعر سادہ تو ہو، لیکن اُس میں جدت نہ پائی جائے، اسی طرح بالکل ممکن ہے کہ ایک شعر اصلیت پر تو مبنی ہو، لیکن رفعت تخیل اور جوش و اثر سے عاری ہو، مثال کے طور پر **مومن** کا یہ شعر ہی لے لیجئے، فرماتے ہیں:

بن چکی جسدم حوادث کی کماں افلاک سے ۔۔۔ خاک کا تودہ بنا انساں کی مُشتِ خاک سے

اس شعر کے الفاظ بھی بالکل سادہ ہیں، اور ترکیب میں چستی بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے معنی زیادہ سے زیادہ یہ ہوں گے، کہ انسان ہمیشہ سے مَوردِ آفات چلا آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس مفہوم کے لئے پیرایہ بالکل معمولی اختیار کیا گیا ہے، جس میں ظاہرا تعجب کی کوئی بات نہیں پائی جاتی، لیکن جب اسی مفہوم کو ایک اور شاعر نے ان الفاظ میں ادا کیا:

کسیے تیغ جفائے چرخ سے امید ہنسنے کی ۔۔۔ جو ہووے بھی تو ہاں شاید دہان زخم خنداں ہو

تو اگرچہ بیان میں قدرے تکلف ضرور پیدا ہو گیا، لیکن جدت اور معنوی لطائف کے علاوہ "تاکید الذم بما یشبہ المدح" کی ایک بہترین مثال پیدا ہو گئی، حُسن بیان کی ایسی نادر مثالیں بہت کم دیکھنے میں آئی ہیں، اسی طرح **غالب** کا ایک شعر ہے:

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہؤا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

محبُوب سے کہتا ہے، کہ تیرے ظلم وستم سے دُنیا میں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے اور تیری جفائیں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں، ظاہر ہے، کہ اس شعر کے الفاظ بالکل سادہ اور عام فہم ہیں، اسی طرح جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس میں بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں پائی جاتی، جس سے تعجّب، اور تعجّب کے ساتھ طبیعت میں کشش پیدا ہو جائے، لیکن جب اسی مفہوم کو دُوسرے الفاظ میں اس طور پر ادا کیا گیا کہ:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں تڑپے ہے مُرغ قبلہ نما آشیانہ میں

تو اگرچہ الفاظ میں قدرے اشکال ضرور پیدا ہو گیا، جس سے معنیٔ مقصُود کے پا لینے میں کچھ دیر کے لئے تامّل سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن محض انداز کی جدّت نے مضمون کو کچھ سے کچھ بنا دیا، اور معانی میں ایک دل کش رعنائی پیدا ہو گئی! تعمیم سے گذر کر جب شاعر نے "مُرغ قبلہ نما" کو بھی اس خوف و اضطراب میں شامل کر لیا، تو اس سے "حسنِ تعلیل" کی بھی ایک نہائت اچھی مثال پیدا ہو گئی! رملٹن کی دُوسری شرط اصلیت ہے، لیکن حق تو یہ ہے، کہ شاعری اور فکر و نظر کے وسیع میدان میں یہ بھی ایک بے جا پابندی ہے، شاعری میں منطقی اصُولوں کو تو کوئی دخل ہے نہیں، شاعری جذبات باطنی، اور واردات قلبی کی صحیح ترجمانی کا نام ہے؛ پس ان حالات میں اگر ایک ایسی بات ظہور میں آ بھی جائے، جو اصلیت کے عام قواعد پر پوری نہ اترتی ہو، تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، بلکہ

اس کا شمار کلام کے معنوی محاسن میں ہوتا ہے، پھر یہ بھی ضروری نہیں، کہ جس شعر میں اصلیت پائی جائے، وُہ اعلیٰ ہی درجے کا شعر ہو، اس سے زیادہ اور کونسا شعر سچّا ہو سکتا ہے :

چشمانِ تو زیرِ ابرو انند　　دندانِ تو جملہ در دہانند

اب شاعر نے یہاں کونسی بات خلافِ واقعہ کہی ہے، حالانکہ اس کو ادنیٰ درجہ کا شعر بھی بمشکل کہا جا سکتا ہے !

حسّان بن ثابت شعر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

وَاِنَّ اَحْسَنَ بیتٍ اَنتَ قَائِلُہٗ　　بَیتٌ یُّقَالُ اِذَا اَنشَدتَّہٗ صَدَقَا

یعنی: "اچھا شعر وہ ہے، کہ جب پڑھا جائے، تو لوگ بول اٹھیں" کہ سچ کہا "۔ لیکن ہمارے نزدیک اس باب میں سب سے عمدہ اور جامع قول ابنِ رشیق کا ہے، وُہ لکھتے ہیں :

فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا　　وَاِذَا رِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا

یعنی: "جب پڑھا جائے، تو ہر شخص کو یہ خیال ہو، کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں، مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے، تو معجز بیان عاجز ہو جائیں"

حق تو یہ ہے، کہ ابن رشیق نے جس لطافت اور خوبی سے عمدہ شعر کی تعریف کی ہے، اس سے بہتر تصوّر میں نہیں آ سکتی، اور غور کیا جائے تو یہ تعریف اپنی جامعیت کے لحاظ سے ملٹن اور حسّان کی بیان کردہ تعریف کو بھی حاوی ہے، ایک بلند پایہ اور اچھے شعر کے لئے ایسے ہی وجد آفرین اور مؤثر الفاظ لانے چاہئیں، گویا :

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس لحاظ سے شعر کی انتہائی خوبی یہ ہوگی، کہ جتنا وہ معانی کے لحاظ سے ایک بہترین شعر ہو، اسی قدر الفاظ بھی عمدہ اور دلنشین رکھتا ہو۔ پھر ساتھ ہی جب اسے نثر بنانا چاہیں، تو نہ بن سکے، شعراء کی اصطلاح میں ایسے کلام کو "سہل ممتنع" کہتے ہیں، مثال کے طور پر میرؔ کا یہ شعر لے لیجئے:

ابکے جنوں میں فاصلہ شائد نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

نقل کیا گیا ہے، کہ مولانا آزردہؔ کے مکان پر جہاں مومنؔ اور شیفتہؔ بھی موجود تھے، یہ شعر پڑھا گیا، بے انتہا تعریف ہوئی، اور سب کو یہ خیال ہُوا، کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے مطابق باندھ کر دکھائے، سب قلم دوات اور کاغذ لے کر الگ الگ بیٹھ گئے، اور فکر کرنے لگے، اُسی وقت ایک اور دوست وارد ہوئے مولانا سے پوچھا، کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں، مولانا نے کہا، قل ہُو اللہ کا جواب لکھ رہا ہوں،

اسی طرح میر خلیقؔ کا ایک شعر ہے:

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو — صاف ادھر سے نظر آتا ہی اُدھر کا پہلو

غالبؔ کا یہ شعر بھی ایسا ہی بے ساختہ پن ظاہر کرتا ہے:

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نثر بھی اس عمدگی اور صفائی سے ترتیب نہیں دی جا سکتی، جس سے کہ

مرزا نے اپنے شعر کو ترتیب دیا ہے "میرٹھ والے بزرگ" بھی ایک شعر اس ضمن میں لاثانی کہہ گئے ہیں، انکا فرمانا ہے :-

نامرد کے ہاتھ میں پہنچ کر شمشیر نیام ہوگئی ہے

اس میں الفاظ کے اختصار، اور بیان کی سادگی کو دیکھئے، پھر تشبیہ کی جدّت اور نُدرت کا بھی اندازہ کیجئے، اور پھر اس پر بھی غور کیجئے، کہ شاعر نے تلوار اور نیام کا ضلع اختیار کرتے ہوئے بھی کس خوبی سے "جوانمردی" اور "بزدلی" جیسی متضاد چیزوں کو انہی دو الفاظ سے ثابت کرکے دکھلا دیا ہے!

اسی کے برعکس جب کلام اپنی صحیح ترتیب پر قائم نہ ہو، تو اس کو "تعقید لفظی" کہتے ہیں، اور ایسی حالت میں اسے نثر بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً غالبؔ کا یہ شعر:

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین کرتا جو نہ مرتا کوئی دم آہ و فغاں اور

یعنی "اگر (میں) تمہیں اپنا دل نہ دیتا، تو کوئی دم اور چین کرلیتا، اور اگر (اسقدر جلد) نہ مرتا، تو کوئی دم اور آہ و فغاں کرتا!"

اس عیب سے بھی ایک شاعر اور ادیب کو محتاط رہنا چاہیئے، کیونکہ اس کا ہونا فصاحت اور روانی میں ایک بڑا خلل پیدا کردیتا ہے،

"تعقید معنوی" بھی اسی بحث کا ایک دُوسرا پہلو ہے، اور یہ عیب اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جب شاعر اپنے مقصد کا اظہار اتنے قلیل اور ناکافی الفاظ میں کرے، کہ اس سے مفہوم کو خاطر خواہ طور پر سیری حاصل

نہ ہو سکے، چنانچہ اس پر بھی ایک مثال پیش کئے دیتا ہوں، ملاحظہ ہو:

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا   کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مطلب یہ ہے، کہ شہد کی مکھی باغ میں جائیگی، تو چھتے بنائے گی، جن سے موم پیدا ہوگا، موم سے موم بتی بنے گی، جب وہ روشن ہوگی، تو پروانے آآ کر جان نثار کرنے لگیں گے، بیچارے پروانوں کو اس سے بچانے کی سب سے اچھی تدبیر یہی ہے، کہ مگس کو باغ میں جانے ہی نہ دیا جائے، یہاں اتنی کڑیاں چھوڑ دی گئی ہیں، کہ سامع کا ذہن اُن کی دریافت سے قاصر رہتا ہے،

بعض دیگر شرطیں شعر میں **تخیّل** کا پایا جانا بھی ایک نہائت ضروری بات ہے، تخیّل کے بغیر شعر پست اور غیر وقیع سا رہتا ہے، تخیّل کیا ہے؟ — فکر و نظر کے ایک عام معیار سے گذر کر کائناتِ قدرت میں ہر اعلیٰ و ادنیٰ چیز کے حقیقی اسباب و عوامل کو دریافت کرنے کے بعد اُن سے بلند اور حکیمانہ نتائج پیدا کرنے کا نام تخیّل ہے، اس کو بھی نفسیّات ہی کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے، لیکن یاد رہے، کہ وجدان اور ذوقِ سلیم کے ساتھ ہی ساتھ یہ چیز بھی وہبی ہے، اور انسان کی ذاتی کوشش کو اس میں بہت کم دخل ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن اگر کوئی چیز تخیّل کو فروغ دے سکتی ہے، تو وہ قدرت کے عجائبات کو ایک وسیع نظر سے مطالعہ کرنا ہے، اس لئے کہ جب برّ و بحر میں

نئی نئی چیزیں انسان کے سامنے آئیں گی، تو لازمی طور پر فطرت کا وُہ حجاب جو چیزوں کے حقائق و معارف اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا، نظر کے سامنے سے اُٹھ جائیگا، دل کے جذبات جو امتدادِ زماں سے مُردہ ہوچکے تھے، نئے سرے سے زندہ ہوں گے، اور اسطرح وُہ اپنی باطنی شورش سے خود کو پاکیزہ اور بلند خیالات کی وسیع فضاؤں میں اُڑتا ہُوا پائیگا!

تخیل کے ساتھ کلام میں اثر کا ہونا بھی ایک نہایت ضروری امر ہے، لیکن جب تک انسان "قال" سے گذر کر سراپا "حال" نہ بن جائے، شعر میں بھی اثر کا پیدا ہونا ایک سودائے خام ہے، اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت سوزِ باطن کی ہے، ورنہ محض ٹھنڈی اور پھیپھسی باتوں میں کیا رکھا ہے، حضرت غالبؔ بجا فرما گئے:

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ   پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یہاں مجھے بے اختیار سیّد انشاءؔ کی ایک غزل یاد آتی ہے، اور چُونکہ ایسی حالت میں کہی گئی، جبکہ زمانہ کے انقلاب نے شاعر کی تمام شوخی اور بذلہ سنجی کو اپنے دستِ ستم سے خاک میں ملا دیا تھا، اس لئے ہر ہر لفظ سوز و اثر میں ڈوبا ہُوا ایک نشتر ہے، کہ بے اختیار دل میں اُترا چلا جاتا ہے، لہٰذا اس لازمۂ شعر کو نمایاں کرنے کے لئے میں اسے یہاں نقل کئے دیتا ہُوں، ملاحظہ ہو:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں   بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی   تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہی اور سر ہے پائے ساقی پر — غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں — نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک — نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے — میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو — جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے اِنشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اسی طرح مظہؔر بھی جو تیسرے دور کے ایک شاعر ہیں، چند اشعار نہایت پُرسوز کہہ گئے، جو اگرچہ اُوپر والی غزل کو تو نہیں پہنچ سکتے، لیکن کہنے والے کی صداقت اور حُسنِ انداز پر ضرور دلالت کرتے ہیں:

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا — ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر — کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

.... پھر کلام میں زور اور دبدبہ و شوکت کا پایا جانا بھی ایک لازمی بات ہے، یہی چیز ہے، جو تخیل اور اثر دونوں کے لئے رُوحِ رواں کا کام دیتی ہے،

مثال کے طور پر آغا حشر کے یہ چند اشعار پڑھ جائیے، کہ سوز و اثر کے ساتھ ہی ساتھ زورِ بیان میں بھی لاثانی ہیں:

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کیلئے

اے دعا! ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے
اے خدا! اب پھیر دے رخ گردش ایام کے

صلح تھی کل جن سے اب وہ برسر پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونو در پئے آزار ہیں

ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزش غم کیلئے
کر رہے ہیں زخم دل فریاد مرہم کے لئے

خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے

رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

یاد رہے کہ اس جگہ دبدبہ و شوکت سے بھی زیادہ ضروری چیز شعر میں جمال معنوی کا ظہور ہے، جمال معنوی سے میری مراد انعکاس (Reflection) ہے، جس طرح دل کی مسرت انسان کے بشرے سے ظاہر ہوتی ہے، اور آنکھیں بے اختیار چمکنے لگتی ہیں، اسی طرح معانی کا جلوہ بھی الفاظ کے اندر ایک تصویر جمال بن کے اتر آنا چاہیئے!

پھر جو چیز شاعر کے لئے ایک خاص امتیاز پیدا کرتی ہے، یا جس سے وہ بقائے دوام حاصل کرتا ہے، اجتہاد اور جدت کا مادہ ہے، تقلید کسی قوم کی تہذیب یا لٹریچر کے لئے موت کا پیغام ہے، اگر کوئی قوم صحیح معنوں میں اپنی زبان اور ادب کو زندہ رکھنا چاہتی ہے، تو اس کے لئے ازبس ضروری ہوگا، کہ اپنی آواز کو دنیا میں بلند کرنے کے لئے

ایک دلاویز جدّت سے کام لے، ایک شخص خواہ کتنا ہی بڑا انشاء پرداز کیوں نہ ہو، لیکن اگر وُہ قوّت تخلیق نہیں رکھتا ہے، تو اس کی بات کو بھی کوئی خاص اثر اور پائداری حاصل نہیں ہو سکتی، اس کے لئے اکبرؔ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں:

وُہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں　　اوروں کی کہی ہوئی جو دہراتے ہیں
انسان یُونہیں ترقیاں پاتے ہیں　　خود سوچ کے حسبِ حال مضمون نکال

شاعر کو چاہیئے، کہ تشبیہات اور استعارات وغیرہ میں ہمیشہ جدّت اور تنوّع کا رنگ نمایاں کرتا رہے، کہ اس سے بھی زبان کو بڑی وسعت حاصل ہوتی ہے، ایک ہی کھانا، خواہ وہ کیسا ہی لذیذ اور عمدہ پکا ہوُا کیوں نہ ہو، اگر مدّت تک متواتر اور مسلسل کھایا جائے، تو اس سے بھی طبیعت گریز کرنے لگتی ہے، پس زبان کا معاملہ تو اس سے کہیں زیادہ لطیف اور نازک معاملہ ہے؛ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیئے، کہ جو خیالات اور اصطلاحات یا تشبیہات و استعارات وغیرہ متقدّمین نے وضع کئے ہیں، ان سے کسی قسم کا استفادہ ہی نہ کیا جائے، بلکہ اگر اصلاح وتحسین کی گنجائش ہو، تو اس سے زیادہ مبارک کام اور کوئی نہیں ہو سکتا:

نکتہ دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش ست　　شاہد معنیٰ کہ باشد جامۂ لفظش کہن

قدرت کے کارخانے میں کمی اب بھی کسی چیز کی نہیں ہے، فقط دماغ کے اندر الہامی خواص کا ہونا ضروری ہے، مولانا جامی فرماتے ہیں:

خم وخمخانہ با مُہر ونشا نست　　ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشا نست

ابتذال بھی اُسی وقت تک ابتذال ہے، جب تک کہ اسے غور وفکر کے معمولی حلقوں ہی تک محدود رکھا جائے، اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے، کہ تشبیہ تو نہائت مبتذل اور پامال سی ہوتی ہے، لیکن محض اندازِ بیان کی خوش اسلوبی سے شعر میں لطافت اور جدت پیدا ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر اس شعر ہی کو لے لیجئے:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

محبوب کی نظر کو اکثر شعراء تیر و پیکان سے تشبیہ دیتے چلے آئے ہیں، اس لئے بظاہر یہ کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن اس شعر میں محض انداز کی خوبی نے معانی میں ایک نزاکت اور دل کشی پیدا کر دی ہے، آتش نے بھی اسی مفہوم کو بالفاظ دیگر ادا کیا ہے:

ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار — جب تیر کج پڑیگا اُڑیگا نشانہ کیا؟

اور اسی طرح آنکھ کو بھی اس کی مستی اور خمار کی بنا پر عموماً ساغر سے تشبیہ دیتے چلے آئے ہیں، لیکن سودا نے اسی مفہوم کو جدت کا رنگ دیکر اس طور پر ادا کیا:

کیفیت چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

"چلا میں" کس بے ساختگی اور چستی سے مستعمل ہوا ہے، گویا یہی دو الفاظ ہیں، جنہوں نے شعر میں ایک ڈرامے کا سا رنگین اور خوشنما منظر پیدا کر دیا، یہ فارسی میں "از کار شدن" کا نہائت عمدہ اور ٹھیٹھ ترجمہ ہے، اس پر مجھے نظیری کا ایک شعر یاد آیا، فرماتے ہیں:

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید	گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

اب سودا کا شعر بجائے خود ایک کارنامہ تھا، لیکن اسپر ایک اور حضرت اٹھے، تو انہوں نے معانی میں اور بھی دلکشی اور نزاکت پیدا کر دی اور اس طور پر گویا ہوئے:

۱) ہم نے دیکھی ہی کسی شوخ کی مستی بھری آنکھ	ملتی جلتی تھی چھلکتے ہوئے پیمانے سے

ذرا غور تو فرمائیے، کہ صرف "پیمانہ" ہی نہیں، بلکہ "چھلکتا ہوا پیمانہ" جو مستی میں بھی ایک طلاطم پیدا کیئے دیتا ہے، یہ حسن کی بے نیازی ہے، جس کے باطنی جذبات آنکھوں میں نشے کی سی کیفیت لے آتے ہیں!

یا مثلاً محبوب کے رخسار کو شمع اور پھول وغیرہ سے اکثر تعبیر کرتے چلے آئے ہیں، لیکن ذیل کی مثالوں میں انہیں چیزوں کو ملاحظہ فرمائیے، داغ کا ایک شعر ہے:

۲) رخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں	اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

محبوب کی شوخی اور رعنائی بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر اسلوب بھلا اور کیا ہوگا، گویا وہ اپنے پرتوِ حسن اور کشش رخسار پر اتنا اعتماد کیئے ہوئے ہے، کہ شمع سے بھی اسپر ضد باندھلی ہے، اور جانتا ہے، کہ پروانہ شمع کو چھوڑ کر اسی طرف آئیگا،

اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے:

۲) برابری کا تری گل نے جب خیال کیا	صبا نے مار تھپیڑا منہ اُسکا لال کیا

زلف کی تشبیہ ملاحظہ ہو:

خیالِ زُلفِ بتاں میں نصیرؔ پیٹا کر گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

شعراء تو کیا اکثر صُوفیاء بھی انسان کے دل کو کعبہ سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں، اور اس کا دُکھانا گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے، یہ بظاہر کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن سوداؔ نے یہاں بھی ایک دلاویز جدّت سے کام لیتے ہوئے اس خیال کو یوں ادا کیا:

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائیگا،

پس معلوم ہُوا، کہ مضمون اگرچہ مبتذل ہی کیوں نہ ہو، لیکن قادرالکلام شاعر اس میں بھی اپنے تصرّف اور حسنِ بیان سے ایک شان پیدا کردیتا ہے،

اس ضمن میں ایک چیز خاص طور پر عرض کردینا چاہتا ہوں، وُہ یہ کہ جہاں ایک اچھی اور خوشگوار شئے کا ذکر کیا جائے، وہاں تشبیہ بھی اس کے لیئے ویسی ہی خوشگوار، اور دلخوش کُن لانی چاہیئے، اسی طرح جہاں کسی مکرُوہ اور ناخوشگوار شئے کا ذکر ہو، تو تشبیہ میں بھی اس کی مماثلت کو پُورے طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے، اعلےٰ شئے کی تشبیہ ادنیٰ شئے سے، اور ناقص چیز کی تشبیہ کامل چیز سے، ہمیشہ باطل اور غیر مفید ثابت ہوتی ہے، ایسا کرنے سے جہاں "وجہِ شبہ" کو ضعف پہنچتا ہے، وہاں "غرضِ تشبیہ" بھی لازمی طور پر فوت ہوجاتی ہے، میں اس کتاب میں آگے چل کر غالبؔ کے تاثرات میں اس حقیقت کو تفصیل سے واضح کرونگا سردست میر انیسؔ کے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں:

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے   جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

حضرت عباس رضؓ جیسی برگزیدہ ہستی کے لیئے شاعر تشبیہ بھی ویسی ہی عمدہ اور کامل لایا ہے، جیسی کہ زیادہ سے زیادہ ممکن ہو سکتی تھی، اسی طرح:

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن   جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

ظاہر ہے، کہ یہاں بھی اہل بیت کے بیگناہ اور مظلوم لوگوں کے لیئے تشبیہ نہائت عمدہ اور اور نادر لائی گئی ہے، جس سے طبیعت کو قدرتی طور پر فرحت اور سرور حاصل ہو،

اسی طرح: ع

پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے

گرمی کی شدت کا اظہار اس سے اچھے پیرائے میں اور کیا ہو سکتا ہے کہ پتوں کو بھی چہرۂ مدقوق سے تعبیر کیا جائے، یہ حسن تشبیہ کے انتہائی کمالات ہیں!

اس کے بعد ضروری ہے، کہ شعر میں **سُوقیانہ الفاظ و محاورات** سے بھی اجتناب کیا جائے، اور نہ ہی ایسی باتوں کا ذکر ہو، جن سے سُوسائٹی کے **اخلاق** پر بُرا اثر پڑتا ہے!

حشو بھی کلام کی بلاغت کو زائل کر دینے والی چیز ہے، لہذا اس سے بھی حتی الوسع مجتنب رہنا چاہیئے، حشو جیسا کہ معلوم ہے، لغت میں اس بھرتی کو کہتے ہیں، جو تکیوں کے اندر دی جاتی ہے، اصطلاح شعری میں جو الفاظ ضرورت سے زیادہ استعمال کیئے جائیں، حشو کہلاتے ہیں،

ائمۂ فن نے بظاہر جو اس کی تقسیم کی ہے، یعنی حشو مفسد، اور غیر مفسد اور پھر غیر مفسد کی بھی تین مختلف صورتیں، یعنی قبیح، متوسط، اور ملیح، یہ تکلف سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہے، زائد اور غیر ضروری طوالت کسی حالت میں بھی مستحسن نہیں سمجھی جا سکتی، یہی وجہ ہے، کہ مستند اور بلند پایہ شاعر ہمیشہ سے اس معاملہ میں محتاط چلے آئے ہیں!

آمد اور آورد میں فرق

آمد اصطلاح شعری میں وہ کلام ہے، جو شاعر کی طبع سے بلا تکلف خود بخود ٹپک پڑا ہو، ایسے کلام میں روانی، اثر اور بے ساختگی اکثر پائی جاتی ہے، اور دل کش بھی ہوتا ہے، اسیطرح **آورد** اس کلام کو کہتے ہیں، جو تکلف سے طبیعت پر دباؤ دیکر پیدا کیا جائے، ایسے شعر میں کوئی خوبی نہیں ہوتی، بلکہ شاعر کی سستئ طبع اور افتاد کا پتہ دیتا ہے، انسانی طبیعت کی ان دو مختلف کیفیتوں کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے، وہ اس شیرہ سے زیادہ لطیف و با مزہ ہوتا ہے، جو انگور سے نچوڑ کر نکالا جائے،

سچ پوچھو تو یہ بھی انسان کے باطنی کوائف کا ایک مدّ و جزر ہے، کبھی تو سمند طبع کے لئے ایک معمولی سا تازیانہ ہی سینکڑوں برس کی جولانیوں کا کام دے جاتا ہے، اور کبھی انتہائی کوشش سے بھی کوئی مؤثر بات پیدا نہیں ہوتی، **بودلیر** (Baudelaire) فلسفۂ جذبات کے اسی دقیق و لطیف نکتے کا ل کرتے ہوئے اپنے

الفاظ میں لکھتا ہے، کہ: "شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب تمام حواس نہائت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہوجاتے ہیں آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں، پُرشور مقامات میں خفیف سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں، اور شور سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں اختلال خیالات واقع ہوتا ہے، اور جملہ اشیائے عالم اپنی صُورت سے بسا اوقات دُوسری صورتوں میں منقلب ہوجاتی ہیں، اور خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہوجاتا ہے، آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں، اور رنگ میں نغمہ پیدا ہوتا ہے"

علامۂ اقبال بھی اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے ۔۔۔ دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

وادئ عشق بسے دُور و دراز است ولے ۔۔۔ طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

سعدی:

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم ۔۔۔ گہے بر پُشتِ پائے خود نہ بینم

غالب بھی اسے تسلیم کرتا ہے، اور کہتا ہے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۔۔۔ چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

یعنی جب تک طبیعت کے اندر ضیق اور تنگی پیدا نہ ہو، لطافت اور روانی کی توقع رکھنا بھی بالکل بے سُود ہے، جب شاعر کی طبیعت پر یہ انقباض طاری ہو، تو اُسے چاہیئے کہ جی بھر کر غسل کرے، اور کھلی ہوا میں سبزۂ و بہار کی سیر و تفریح کیلئے جہاں بھی مناسب سمجھے نکل جائے،

حتّیٰ کہ اس عمل سے اس کی افسردگی اور کلفت زائل ہو، اور وہ دوبارہ اپنی طبیعت کو فکرِ شعر کے لئے آمادہ و تیّار پائے!

یہ چند ایسی باتیں تھیں، جو شعر و شاعری کے صحیح تعارف کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیرِ قلم لائی گئیں، اور جن کا جاننا اہلِ ذوق حضرات کے لئے ازبس ضروری تھا، اب ہم انہیں خصوصیات کی روشنی میں غالبؔ کی شاعری اور اس کی **اجتہادی قابلیّت** پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے، اس ضمن میں ہر مضمون کے لئے ایک مناسب عنوان تجویز کر دیا گیا ہے، تاکہ اشعار کی ترتیب و تنسیق میں ناظرین کو کسی طرح کی دقّت پیش نہ آئے؛ دورانِ بحث میں بعض اشعار مکرّر بھی آئیں گے، لیکن ہر جگہ انپر ایک جُداگانہ حیثیّت سے نظر کی گئی ہے، جس سے مضامین کے تنوّع میں بجائے خود کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا ❖

باب دوم (۲)

مرزا کی شاعری

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

عشقیہ — غالب کی عشقیہ شاعری اپنے اندر کچھ ایسی خصوصیات لئے ہوئے ہے، کہ وہ اوروں کے ہاں دیکھنے میں نہیں آتیں، حسن و عشق کے لطیف اور وجدانی تاثرات کو باتوں ہی باتوں میں یوں ادا کر جاتے ہیں، کہ گویا یہ بھی روزمرہ کی ایک معمولی سی عادت تھی، اوّل تو دیکھئے، کہ عشق کی شان میں کس انداز سے گوہر افشانی فرماتے ہیں:

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

مدعا اس شعر کا یہ ہے، کہ دنیا کی رونق اور زندگی کا لطف عشق ہی کے احساس سے ہے، اور اگر یہ نہ ہوتا، تو ہر جگہ ویرانی ہی ویرانی تھی، گویا مرزا بھی شیلے کی طرح عشق کو ہستئ واحد خیال کرتے ہیں، جس کا تسلسل فی الحقیقت زندگی اور کائنات کا تسلسل ہے، شعرائے فرنگ میں سے شیلے ہی ایک ایسا شاعر ہے، جسے میں نے انداز کی خوبی، محاسنِ ادبیہ

کا پورا پورا التزام، جدّت آفرینی، تخیّل کی وُسعت، موسیقی اور شاعرانہ کمالات کے ساتھ ہی ساتھ فلسفیانہ طرزِ بیان میں بھی مرزا سے بہت کچھ مماثل پایا، چنانچہ وُہ بھی "فلسفۂ محبّت" میں عشق کے اسی عالمگیر قانُون کو کس خوبی سے ادا کرتا ہے، اور کن کن مناسبات سے فطرتِ انسانی کے اس گہرے احساس کی ترجمانی کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

"چشموں کا پانی ایک عجیب رقّت سے، ایک نہ سنبھل سکنے والے اضطراب سے بہتا ہے اور دوڑتا ہوا ٹھوکریں کھاتا ہوا بالآخر دریا میں آن ملتا ہے، پھر دریا بھی بجائے خود چین نہیں لیتا، تاوقتیکہ اپنے کو ایک بحرِ ناپیدا کنار کے سپرد نہ کرلے، ہوائیں ایک لطیف اور شیریں احساس کے ماتحت ایک دُوسرے میں جذب ہوئی جاتی ہیں، قمری بھی اپنی گردن میں محبّت کا طوق پہنے ہوئے ہے، اور لالہ بھی اپنے جگر میں عشق کا داغ رکھتا ہے، — الغرض دنیا میں کوئی شے بھی ایسی نہیں، جو یکہ و تنہا ہو، کائنات کا ذرّہ ذرّہ ایک آسمانی قانُون کی خوشی منانے کے لئے، اور ایک فطری ضرورت کی تعمیل میں ایک دُوسرے کے اندر محو ہوگیا ہے، پھر کیا وجہ، او تغافل کیش محبُوب، پھر کیا وجہ ہے، کہ تو مجھے اپنے وصال سے لذّت یاب ہونیکا موقع نہیں دیتا؟ آہ! کیا کہوُں اور کس سے عرض کروُں:

فلکؔ دُور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

دیکھ، خدارا آنکھیں کھول کر دیکھ، اور انصاف کو کام میں لا، پہاڑوں کی چوٹیاں، یہ مغرور و سرکش چوٹیاں، آسمانی بلندیوں کو بوسہ دے رہی ہیں

— اگرچہ یہ گستاخی ہی سہی! موجیں ایک دُوسری کو آغوش میں لئے ہوئے ہیں' — اگرچہ اس کو شوخی ہی کیوں نہ کہا جائے! 'بلبل شاخِ گلبن پر بیٹھی ہوئی چہچہا رہی ہے' — اگرچہ اس کو بے ادبی ہی سے کیوں نہ تعبیر کریں[1]! — لیکن ہے تو سب عشق ہی کی بیخودی نا؟' پھر الزام کیسا اور شکائت کیوں؟ .... ہم کہیں گے:

ہے وُہی بدمستیٔ ہر ذرّہ کا خود عذرخواہ — جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

ایک پھُول جو اپنی نوع سے پیار نہ رکھے، کبھی عفو کے قابل نہیں ہو سکتا' آہ! تو نے کبھی غور بھی کیا، کہ آفتاب کی شعاعیں زمین کو کس لئے اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں، اور ماہتاب کی کرنیں کیوں سطحِ سمندر کو چوم چُوم لیتی ہیں؟' .... خیر یہ سب کچھ ہو لینے دو، اور ہر شئے کو اپنی ہم جنس شئے سے جی بھر کر محبّت کر لینے دو، لیکن اگر میرا معشوق مجھے نہیں چاہتا ہے اور اپنے لب لعلین تک رسائی کی اجازت نہیں دیتا، تو یہ تمام چیزیں میرے کس کام کی؟" [2]

پھر اقبالؒ کا نظریہ بھی محبّت کی اسی شورش انگیز مگر خاموش وحدت

---

[1] ناسخ کا ایک شعر ہے:

عشق میں حدِّ ادب سے آگے رہتا ہی قدم — شاخ گلبن پر سے بلبل کو اڑایا چاہیئے

[2] اس بیان میں جن اشعار کا از خود اضافہ کیا گیا، وُہ محض شاعر کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کو ملحوظ رکھ کر استعمال میں لائے گئے ہیں، انہیں کو خارج کر کے دیکھ لو، مضمون کا لُطف آدھا بھی باقی نہیں رہتا ۱۲ منہ

وحدت کا مؤید ہے، چنانچہ :

یہ صدائے قمری و بلبل فریب گوش ہے　　باطن ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے

یہ "عشق" کی ابتدائی تشریح تھی، جس کا یہاں ذکر ہوا، اور جسے "شاہد فردوس معانی" میں اور خود اسی کتاب میں کسی دوسرے مقام پر اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے، لیکن سردست اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہوئے ہم اس ضمن میں مرزا کے کلام پر بحث کرتے ہیں،

عشق کے وجدانی احساسات کو روزمرہ کوائف کے مطابق پیش کرنا مرزا کا خاص کمال ہے، اردو شاعری میں جرأت کو "معاملہ بندی" کا استاد تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن غالب بھی جہاں ایسے رازونیاز پر اُتر آتے ہیں، تو ہر دوسری چیز اُن کے مقابلے میں پھیکی اور بے مزہ سی معلوم ہونے لگتی ہے، مثلاً :

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

اردو تو کیا فارسی کی عشقیہ شاعری میں بھی ایسی عمدہ مثالیں ڈھونڈنے سے کہیں دستیاب نہیں ہوتیں، اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار　　جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

ایک تعجب خیز حسرت سے کہتا ہے، کہ محبوب نے آنکھ بھر کر تو مجھے دیکھا نہیں تھا، لیکن یہ کیا معاملہ ہے، کہ اس کی نظریں میرے دل کے پار ہوئی جاتی ہیں، گویا :

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

شوق و اضطراب کی ایسی متضاد کیفیتیں بہت کم دیکھنے میں آئی ہونگی، اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں　　یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہؤا تھا

مطلب یہ ہے، کہ محبوب اگرچہ ہم سے خفا ہے، لیکن یہ بھی تو غنیمت ہے، کہ امتدادِ زماں سے جذبۂ عشق نے جو افسردگی کی صُورت اختیار کر لی تھی، وُہ اس تشویش اور اضطراب کی حالت میں نئے سرے سے زندہ ہوگا اور ذوقِ طلب میں زندگی کی ایک نئی شان پیدا ہو جائیگی، یہ بھی حسن وعشق کی ایک وجدانی کیفیّت تھی، جسے مرزا نے نفسیاتی قوانین کے ماتحت اس خوبصورتی سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، اسی طرح کون نہیں جانتا، کہ حسن وعشق کے معاملات میں رقابت ایک نہائت ہی ناخوشگوار اور قبیح منظر کا نام ہے، لیکن مرزا نے اس عام نظریئے سے بھی استثناء کی صُورت پیدا کر کے اس موضوع پر ایک بالکل نئی چیز کا اضافہ کیا، فرماتے ہیں :

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے　　ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

صرف اسی حد تک محدُود نہیں، بلکہ مرزا اپنے رنگ میں نہائت دِلکش اور لطیف انداز کے ساتھ ان مضامین میں ایک ایسی موسیقی اور ترنم بھی پیدا کر دیا کرتے ہیں، جو خاص انہیں کا حصّہ ہے، مثلاً :

نیند اُسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اُسکی ہیں　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

یہاں محبوب کے وصال ہی میں زندگی کی تمام راحتوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اسی طرح :

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

سبحان اللہ! موت و حیات جیسی دو متضاد باتوں کو کس حسن انداز سے ایک کر دکھایا ہے، محاورہ کی خوبی معانی کی لطافت میں جذب ہوئی جاتی ہے!

پھر کہتے ہیں :

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کتنا لطیف احساس ہے، اور کسقدر پاکیزہ خیال! عاشق اور معشوق کے راز و نیاز کو ظاہر کرتی ہوئی اس سے زیادہ سچی اور موثر کیفیت اور کیا ہو سکتی ہے، یہ شعر صداقت اور واقعیت کا ایک ایسا دلکش پیکر ہے، کہ اس کے نقوش فطرت انسانی کے لطیف سے لطیف تاثرات کو بھی اپنے اندر محصور کیئے ہوئے ہیں، انسانی جذبات کی نفسیاتی تحقیق اس سے بہتر ممکن نہیں!

اسی طرح :

پرسش طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

فرماتے ہیں، کہ محبوب سے دل اڑا لینے کا طریقہ دریافت کرنا بھلا کونسی ضروری چیز ہے، اس کی تو ہر ادا اور ہر غمزہ از خود بتلائے دیتا ہے کہ ہم اس طرح دلوں پر قبضہ جما لیا کرتے ہیں، اور اس "سادگی و پرکاری" کی انتہا یہ ہے، کہ اس کی عبادت بھی اپنے اندر جفا کاری اور ظلم و ستم

کا ایک انداز لیئے ہوئے ہے :

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

حق تو یہ ہے، کہ اس باب میں **نظیری** نے جو کچھ کہا، اُسے حسنِ بیان اور بلاغت کا انتہائی کمال کہا چاہیئے، چنانچہ:

زفرق تا قدمش ہر کجا کہ مے نگرم　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

یہ "دلبری" کچھ نرالی شان کی دلبری ہے، دُنیائے شعر میں اس کی مثال نہیں، محبُوب کا سراپا بیان کیا ہے، لیکن اس رنگینی سے کہ مصوّر کے سینکڑوں کارنامے اور حسن و عشق کی بیسیوں داستانیں اس پر سے قُربان کی جا سکتی ہیں، جن لوگوں نے اس تاثر کو دیکھا، اور سمجھا ہے، وہی اس کی شوکت کا صحیح اندازہ بھی کر سکتے ہیں،

میرؔ نے بھی اس کا ترجمہ کیا تو سہی، لیکن وُہ شوخی اور رعنائی پیدا نہ ہو سکی، جو اصل شعر میں ہے، چنانچہ کہتے ہیں :

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اُس کے　　آتا ہے مرے جی میں یہیں عُمر بسر ہو

پھر ذرا تعمق سے کام لیا جائے، تو معلوم ہو گا، کہ مرزاؔ کی عشقیہ شاعری کا ما بہ الامتیاز زیادہ تر **رشک** کا مضمون ہے، ایسی مثالیں ان کے ہاں بکثرت ملیں گی، لیکن جہاں بھی اس خیال کو ادا کیا ہے، جدّت کا پہلو کہیں بھی فوت ہونے نہیں پایا، مثلاً :

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام　　رخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

فرماتے ہیں، کہ میں دوست کے بارے میں اس قدر بدگمان ہوں، کہ اس کا

سرگرم خرام ہونا بھی مجھے گوارا نہیں، اس لئے کہ چلنے سے پسینے کے جو قطرات اس نازنین کے چہرہ پر نمایاں ہوں گے، ان پر بھی مجھے غیر کی اُن آنکھوں کا اشتباہ ہوتا ہے، جو اس کی شوخیٔ حسن کو دیکھ کر فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں، اپنے رشک کو اس انداز سے ظاہر کرنا حسنِ بیان کی انتہا ہے، اسی طرح جو تشبیہ اس ضمن میں لائی گئی ہے، وُہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ "قطرۂ عرق" کو "دیدۂ حیران" سے تعبیر کرنا شعریت اور نزاکت کا انتہائی کمال ہے،

اس حد تک تو رشک کا تعلق محض رُخسار اور چہرے سے تھا، لیکن ایک بات اس سے بھی بڑھ کر پیدا کی جا سکتی تھی، سو اس کا اظہار مرزا نے اس طور پر کیا:

اُبھرا ہؤا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

یعنی جستجوئے شوق میں رقیب کی نگاہیں تو کہیں نقاب کے اندر اُلجھ کر نہیں رہ گئیں؟ گویا:

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وُہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

کہتے ہیں کہ محبوب تک رسائی حاصل کر لینا تو ایک بڑی چیز ہے، میں تو اتنا بھی گوارا نہیں کر سکتا، کہ اسے کوئی آنکھ بھر کر دیکھ ہی لے، غیر تو غیر یہاں خود کو بھی اس معاملہ میں معذور تصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اور یہی خیال ایک دُوسری جگہ:

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　　مرتے ہیں ولے انکی تمنا نہیں کرتے

پھر فرماتے ہیں :

اپنی گلی میں مجکو نہ کر دفن بعدِ قتل　　میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ظاہر ہے، کہ یہ بھی رشک کے موضوع پر اپنی طرز کا ایک بالکل اچھوتا اور نرالا تخیل ہے، پھر فرماتے ہیں :

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے　　نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

یعنی رقیب کے لئے دوست کا پا لینا اگرچہ ایک نہائت دشوار امر ہے، لیکن ہمارے لئے تو فقط اس کا آرزومند ہونا بھی بلائے جان ثابت ہو رہا ہے، گویا مرزا کے نزدیک محبوب کی خواہش کرنا شانِ غیرت کے سراسر خلاف ہے، اسی طرح :

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے　　مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھکر

محبوب ہاتھ میں برہنہ تلوار لئے آتا ہے، لیکن یہ ہیں، کہ بجائے خوفزدہ ہونے کے رشک ہی سے مرے جاتے ہیں، کہ اے کاش! تلوار نے جس ہاتھ تک رسائی حاصل کر لی ہے، میں کیوں اس سے محروم رہا، پھر فرماتے ہیں :

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

یہ شعر بھی اُسی احساس کا ترجمان ہے، جس کا اُوپر ذکر ہُوا، جس طرح گوہر کی انتہائی شان یہ ہے، کہ وُہ محبوب کے گلے کا ہار بنے، اسی طرح گوہر فروش کی انتہائی خوش قسمتی یہ ہے، کہ اس کے بیچے ہوئے موتی اُس نازک اور

صراحی نما گردن میں جھلکتے ہوئے دکھائی دیں، لیکن غریب مرزا کے حصّے میں یہاں بھی سوائے رشک کے اور کچھ نہیں آیا، اسی انداز پر ایک اور شعر ہے :-

تیرے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں   ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

اس کے علاوہ :-

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں   ہر اِک سے پوچھتا ہُوں کہ جاؤں کدھر کو میں

"جاؤں کدھر کو میں"؟ یہ کوئی بامعنی فقرہ نہیں ہے، لہٰذا نہ کوئی اسے سمجھ سکتا ہے، اور نہ محبُوب کے گھر کا صحیح پتہ چلتا ہے، اور یہ ہیں، کہ رشک کے مارے ہوئے جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں!

غالبؔ کی عشقیّہ شاعری پر ایک حد تک بحث ہو چکی، اب ہم دُوسرے عنوان کو لیتے ہیں :

صُوفیانہ مرزا کا تصوّف بھی ذوقِ معرفت اور روحانی زندگی کے بلند ترین اصولوں سے لبریز ہے، جو بات دُوسروں کے ہاں خاص ہے، انکے نزدیک عام ہے، اور جسے یہ خاص سمجھتے ہیں، اس کا منبع سدرۃ المنتہیٰ سے بھی پرے انوار اور تجلّیات الٰہی کا وُہ سرچشمۂ حیات ہے، جو عرشِ معلّٰے کے نیچے نیچے بہتا ہے، جہاں نہ انسانی آنکھ کو رسائی ہے، اور نہ فکر و غور کا قدم وہاں دخل پا سکتا ہے، مرزا انسان کی اس کوتاہ بینی اور غفلت کا جب ذکر فرماتے ہیں، تو کہتے ہیں :

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

یعنی دُنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں، جو محبُوبِ حقیقی کے پرِ توِ جمال سے متجلی نہ ہو، لیکن تمہاری اپنی آنکھ اس قابل نہیں، کہ تم اس کے اسرار اور کیفیات کو دیکھ سکو، اور نہ تمہارے کان ابھی اس لائق ہوئے ہیں، کہ معرفتِ الٰہی کے اُن نغموں کو سُن سکیں، جو کائنات کے ذرّے ذرّے سے پیدا ہو ہو کر بارانِ نُور کی طرح فضا میں پھیل جاتے ہیں، اِس لحاظ سے انسان کی یہ کیفیت وَاِنْ مِّنْ شَیْئٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ[1] کی مصداق ثابت ہو رہی ہے،

عرفی نے بھی اس خیال کو نہائت خوبی سے ادا کیا ہے، وہ کہتا ہے:

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ   اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

پھر مرزا کے نزدیک انسانی شرف کا جو انتہائی معیار ہے، اُسے بھی ملاحظہ فرمائیے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تو گویا:

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر   ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس مرتبۂ کمال کو پالینے کے بعد بھی انسان حقائقِ اشیاء کو سمجھ نہ سکے تو یہ اُس کی انتہائی بد قسمتی ہے، مرزا فرماتے ہیں:

قطرہ میں دِجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کل   کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا!

---

[1] آیۂ شریفہ: "آسمان و زمین میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں، جو خدا کی حمد و ثناء بیان نہ کرتی ہو، لیکن تم (اپنی ناقابلیت کی وجہ سے) اس کو سمجھ نہیں سکتے" ۱۲ منہ

اس شعر کا حسنِ انداز اور زورِ بیان حد درجہ قابلِ داد ہے، اس کے بعد مرزا ایک سالک کے اُن مدارج کو جو اُسے راہِ معرفت میں پیش آیا کرتے ہیں، اس طور پر بیان فرماتے ہیں:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ان صدہا مشکلات کو جو اس خطرناک منزل میں ایک طالبِ حق کو پیش آسکتی ہیں، اس خوفناک اور موثر پیرایہ میں ظاہر کرنا، مرزا جیسے نغز گو شاعر ہی کا حصّہ ہو سکتا ہے!

پھر فرماتے ہیں:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینۂ دائم نقاب میں

فلسفۂ تصوّف پر یہ ایک عدیم النظیر شعر ہے، اس میں ثابت یہ کیا ہے، کہ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اُسی کے پرتوِ جمال سے زندہ ہے، وہ بذاتِ خود اگرچہ بہ تقاضائے کبر و غرور اپنے چہرہ پر نقاب لئے ہوئے ہے، لیکن اُس کی تجلّیات نقاب سے بھی چھن چھن کر عالم کو بقعۂ نور بنائے دیتی ہیں، تو گویا:

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یُوں حجاب میں

جب حُسن کا فیض اس قدر عام ہے، تو کہاں ہے وہ آنکھ جو اس سے لذّت یاب ہو، اور کہاں ہے وہ دل جو اس کی شعاؤں کو اپنے اندر جذب کرلے؟ ':

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

تو اس لحاظ سے معلوم ہوا، کہ خود ہمارا وجود بھی اُسی پردہ نشین کے ناز و ادا، اور ذوقِ تزئین کا ایک اُدھورا سا نقش ہے :-

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں [1] ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

جب دُنیا ارتقاء کی ان منزلوں سے گزرتی ہوئی اپنی تکمیل کو پہنچ لیگی تو وہ بھی فوراً اپنی نقاب اُلٹ دیگا، کوئی چیز اُس کی تاب نہ لاسکے گی، ذرّہ ذرّہ اپنی جائے قرار سے متحرک ہوگا، کائنات میں ایک بے پناہ اِنتشار پیدا ہوگا، اور اسی کا نام ہنگامۂ محشر ہے !

ہوئی اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے [2] پرافشاں جوہرِ آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں

اور ابھی ہر چیز اپنے فطری ذوق کی بنا پر اس وقت کے انتظار میں ہے، اور مادہ اندر ہی اندر جوش کھاتا ہے :

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا آئینہ فرشِ ششش جہت انتظار ہے

اس کے بعد مرزا کے صوفیانہ جذبات میں ایک خاص بات یہ بھی ہے

---

[1] ملٹن بھی "گمشدہ بہشت" میں ایک فرشتے کی زبانی بنی نوع کو یہی پیغام پہنچاتا ہے، وہ کہتا ہے : "اے آدم! وہی خدائے بزرگ و برتر اور وہی قادرِ مطلق ہے، جسے ہم تمام موانئی تاثرات کا منبع و مخرج قرار دے سکتے ہیں، اور فی الحقیقت وُہی ذاتِ واحد ہے، جس سے تمام چیزوں نے ظہور پایا، سو اگر تم اپنی تخلیق کے مقصد کو پہچانو، اور اُس کے فرمانبردار ہو جاؤ، تو یاد رکھو! کہ پھر اس سے زیادہ فیاض اور مہربان بھی اور کوئی نہیں ہو سکتا، ... تم دُنیا میں اس کے جلال اور کبریائی کے ایک بہترین مظہر ہو، اُس کا حسن قدر افزائی چاہتا ہے، اور تمہارا کام ہے محبت کرنا!"

[2] قرآن مجید میں جہاں وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ (پہاڑ اس روز دُھنی ہوئی پشم کی طرح ہر طرف اڑتے ہوئے دکھائی دینگے) کا ذکر آیا ہے، تو سمجھ لینا چاہیئے، کہ یہ دُنیا کے اسی اختتام کا نقشہ ہے"

کہ وُہ انسان کو عبادت کے معاملہ میں اخلاص کی بڑی تاکید کرتے ہیں، مثلاً :

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

گویا جہاں یہ ہیں، وہاں نفسانی خواہشات کو کوئی دخل نہیں، جزا کی تمنّا رکھنا تو ایک قسم کی سوداگری ہے، ایک طالب حق کے نزدیک خدا کا غضب ہی اُس کے لئے جہنّم ہے، اُسے جنّت کی گوناگون نعمتیں اتنی بھلی معلوم نہیں ہوتیں، جتنی کہ اپنے محبُوب کی خوشنودی، اسی بنا پر ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا　　وُہ اِک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

اور بقولِ **مومن** :-

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیرے خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنّت کا

اخلاقیات حق تو یہ ہے، کہ اخلاقیات کی جیسی عُمدہ تعلیم مرزا نے دی ہے، کسی اور کے ہاں دیکھنے میں نہیں آئی، انداز نہائت پیارا اور دلاویز ہے، بعض جگہ ایک بات کو غزلیت کا رنگ دیکر اس طور پر بیان کر جاتے ہیں، کہ زبان سے سوائے تحسین و آفرین کے اور کچھ نہیں نکلتا، اس ضمن میں سب سے مقدّم چیز **غیرت** اور **خودداری** کی تعلیم ہے، کیونکہ مرزا کے اخلاقی حصۂ کلام کا بیشتر عنصر ایسے ہی عُمدہ مضامین پر مشتمل ہے، اسلئے چند مثالیں یہاں نقل کر دی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو :

درد منت کشِ دوا نہ ہُوا — میں نہ اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا

یعنی اگر میں صحتیاب نہ بھی ہُوا، تو اس میں کیا بُرائی ہے، کسی دوا کا شرمندۂ احسان تو نہیں، اسی طرح:

رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو — خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

فرماتے ہیں، کہ ہمیشہ کی نا امیدی اس سے کہیں بہتر ہے، کہ میرا نالہ کسی اثر کا شرمندۂ احسان ہو، اور ایسی حالت میں اُمید کا بر نہ آنا بھی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے، ایک اور جگہ کہتے ہیں:

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ — اپنے سے کھینچتا ہُوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

یعنی میری بیکسی اگر ہے بھی، تو اپنے ہی لئے ہے نا، کسی اور پر تو اس کا بوجھ نہیں، اس لئے اگر ایسی حالت پر نادم اور شرمندہ بھی ہُوں، تو یہ بھی میرے اپنے ہی لئے ہے، کسی اور کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا، اسی انداز پر ایک اور شعر ہے:

دیوار بارِ منتِ مزدُور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

کسی گھر والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ اگرچہ تیرے گھر کی دیوار جھکتے جھکتے اب بالکل گرنے کے قریب آن پہنچی ہے، لیکن اس کی مرمت ہرگز نہ کرائیو، کیونکہ تجھے معلوم نہیں، کہ دیوار کا خم ہو جانا منتِ مزدور کا بوجھ نہ سہار سکنے کی وجہ سے ہے، اس لئے دیوار گر جائے، تو گر جائے، لیکن کسی کا شرمندۂ احسان ہونا اچھا نہیں، الغرض:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

پھر غیرت اور خودداری کی انتہا یہ ہے، کہ :

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو[1]

کیونکہ در و دیوار، ہمسایہ، پاسبان، تیماردار، اور نوحہ خواں وغیرہ تمام ایسی چیزیں ہیں، جن کے معاملات سے لازمی طور پر ہمیں شرمندۂ احسان ہونا پڑیگا، لہذا ایسے اسباب ہی کو منقطع کر دینا چاہیئے، جن سے اس ذلّت اور ندامت کا امکان ہو،

عشقیّہ معاملات میں محبوب کی غفلت اور کج ادائی کا برداشت کر لینا عاشق کے لئے کوئی نئی اور عجب چیز نہیں ہے، لیکن یہاں بھی جب حالات اس کے برعکس ہوں، اور عشق کی غیرت کسی ایسے اقدام کی اجازت نہ دے، جس سے اس کی صداقت کو صدمہ پہنچتا ہو، تو مرزا صاف لفظوں میں پکار اُٹھتے ہیں، :-

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
یعنی اے تغافل کیش محبوب! سُن رکھ کہ اگر تیرا غرورِ حسن تجھے اس بات

[1] تعجب ہے کہ یہی خیال پوپ کے ہاں بھی بالکل انہیں الفاظ میں پایا گیا، وہ کہتا ہے :-

Thus let me live, unseen, unknown,
Thus unlamented let me die,
Steal from the world, and not a stone,
Tell where I lie.

کی اجازت نہیں دیتا، کہ تو مجھ سے محبّت اور تپاک کے ساتھ پیش آئے تو میں بھی بایں ہمہ عجز و نیاز بڑی جرأت اور انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ تجھے مُسترد کر دینے کے لئے تیار ہُوں، اور اس میں کوئی چیز بھی مجھے مانع نہیں آسکتی۔" پہلو تہی کرنا" محاورہ کی رُو سے نفرت اور بے التفاتی کا اظہار کرنے کو کہتے ہیں، حقیقت میں یہی پاکیزہ احساس ہے، جس کی ترجمانی ایک دُوسری جگہ مرزا نے اس طور پر کی :

وُہ اپنی خُو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اور سچ پوچھیئے تو اس تمام بحث کا حاصل عزّتِ نفس کی پاسداری ہے، اور کچھ نہیں!

علاوہ ان باتوں کے حسد کا علاج کیا خُوب تجویز فرمایا ہے، کہتے ہیں:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

چشمِ حاسد کی تنگی مشہور ہے، جب ایک شخص کسی محدُود جگہ میں رہتے رہتے کسی کے کمال یا ترقی کو دیکھ دیکھ کر حسد کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو اُس کا بہترین علاج یہ ہوگا، کہ وُہ بیرُونی دُنیا کا بھی مشاہدہ کرے، کیونکہ جب وُہ دیکھیگا، کہ ترقّی محض ایک اتفاقی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے جستجو اور محنت سے بھی کام لینا پڑتا ہے، تو اس حقیقت کے روشن ہو جانے پر اس کی باطنی کاوش مٹ جائیگی، اور وُہ تحصیلِ کمال میں بذاتِ خود ساعی ہوگا؛ نیز جب وُہ دیکھیگا، کہ مجھ سے زیادہ نادار اور خراب حال لوگ بھی دُنیا میں موجود ہیں، تو اس مشاہدہ سے

بھی اس کے دل کو ضرور تسلی حاصل ہوگی ،

گویا بقول خیّام :-

ہر گہ غمے ملازم دِل شود ت   با قصۂ کارِ خویش مشکل شود ت

حالِ دِل دیگرے بباید پرسید   تا خوشدلی تمام حاصل شود ت

پھر گفتگو اور طرزِ کلام میں بھی احتیاط اور نرمی کی تلقین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ :

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر   کی جس سے بات اسنے شکائت ضرور کی

یعنی لوگوں کے ساتھ شیریں کلامی اور تلطف سے پیش آنا چاہیئے ، تلوار کا گھاؤ مِل جاتا ہے، لیکن زبان کا پیدا کیا ہُوا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا، قرآن مجید کی ایک آیت ہے : اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ؕ یعنی "جب تم کسی شخص کو راہِ راست کی طرف دعوت دو، تو چاہیئے، کہ اُسے شیریں کلامی اور حکمتِ عملی کے ساتھ پیار اور محبّت سے اپنی طرف بلاؤ، اور گفتگو کا ایسا پیرایہ اختیار کرو، کہ وُہ تم سے متنفّر نہ ہو جائے۔"

اسی طرح جب عفو و درگذر کی تعلیم دیتے ہیں، تو فرماتے ہیں :

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی   نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی   بخش دو گر خطا کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ   کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

ایک اور جگہ کہتے ہیں :

جو مدّعی بنے اُس کے نہ مدّعی بنیے جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

یعنی جب مشکلیں حل ہو گئیں، اور حالات نے ماضی کی شکل اختیار کر لی، تو اب شکوہ و شکایت سے کیا حاصل، لہٰذا مصلحت اسی میں ہے، کہ حریفوں کی سختیوں اور جفا کاریوں پر چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے، عفو و درگذر سے کام لیا جائے، یہاں بھی قرآنِ مجید کا ارشاد پیشِ نظر رہنا چاہیئے: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ یعنی: "جہاں تک ہو سکے برائی کا جواب بھلائی سے دو، کیونکہ جب تم لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ گے، تو دشمن بھی اس طرزِ عمل کو دیکھ کر تمہاری دوستی اور محبّت کا دم بھرنے لگیں گے۔"

مرزا کا ایک قطعہ پند و موعظت میں لاثانی ہے، اور اسی پر ہم اس بیان کو ختم کرتے ہیں:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غوائی

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

فلسفیانہ

یوں تو مرزا کا انداز ہی بجائے خود ہمیشہ فلسفیانہ ہؤا کرتا ہے لیکن پھر بھی ذیل میں چند ایسی مثالیں نقل کر دی جاتی ہیں، جن سے شاعر کی بلند نظری اور فلسفیانہ ذوق کا خاص طور پر پتہ چلتا ہے۔ فرماتے ہیں :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہ شاعرانہ انداز میں ایک شکایت آمیز حمد وستائش ہے، جس سے اپنے محبوب کے ساتھ ناز وادا اور شوخی کا اظہار بھی ہوتا ہے، ولائت میں رسم تھی، کہ داد خواہ کاغذی جامہ پہنکر عدالت میں جایا کرتے تھے، مرزا اُسی خیال کے پیش نظر فرماتے ہیں، کہ جس طرح ایک تصویر اپنے مصوّر کے کمال کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح دُنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز بھی اپنے صانع حقیقی یعنی خداوند تعالےٰ کے کمالِ صنعت پر بزبانِ حال داد دے رہی ہے لیکن قاعدہ ہے، کہ جب ایک چیز پیدا کی جائے، تو اُس پر تنقید بھی ہوتی ہے، پس اس چیز کا فریاد کرنا اس وجہ سے ہؤا، کہ اگر مجھے پیدا کیا تھا، تو دیکھنے والوں کو بھی ایک ایسی نظر عطا کی ہوتی، جس سے وُہ میرے اسرار و رموز کو کما حقہٗ سمجھ سکتے، تو گویا :

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصوّر سے گلہ رکھتا ہوں میں (اقبالؔ)

جب انسانی بستیوں پر غفلت اور جمود کی یہ کیفیت طاری ہو اور

بے بصیرتی اس حد تک پہنچ جائے، تو پھر ظفرؔ کا یہ قول صادق آئیگا:

روز معمورۂ دُنیا میں خرابی ہے ظفرؔ　　ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

پس یہی ہے غائت اُس مفہوم کی جسے مرزاؔ نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے،

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

اس شعر میں سمجھانا یہ چاہتے ہیں، کہ ہماری موجودہ ہیئتِ کذائی میں بربادی اور فنا کے آثار بھی ایک مبہم اور نامعلوم طور پر پائے جاتے ہیں، اور مثال کے طور پر ہماری یہ کیفیت اُس کسان کی محنت اور جانفشانی سے مشابہ ہے، جو رات دن کھیت پر کام کرتا رہتا ہے، اور اسے معلوم نہیں ہوتا، کہ خون کی وُہی حرارت جو لگاتار اور مسلسل کام کرنے سے پیدا ہوئی تھی، نتیجہ کار برق کی صورت اختیار کرتے ہوئے خرمن کو جلا کر خاک سیاہ کر ڈالے گی، "خونِ گرم" استعارہ ہے "محنت شدید" سے، اگر اس مفہوم کو اور بھی زیادہ صاف کرنا چاہیں، تو اقبالؔ کے ایک شعر سے تطبیق دی جا سکتی ہے، وُہ فرماتے ہیں:

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل　　عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

اس شعر کا مطلب غالبؔ کے شعر سے بالکل متضاد واقع ہوا ہے، یہاں عدم سے ہستی کا اثبات کیا گیا ہے، تو وہاں ہستی سے عدم کا،

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے :

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم   ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہاں مذاہب اور ادیان کے فلسفۂ ضعف و قوّت کو بیان کیا گیا ہے، اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں عالمِ محسوسات پر نظر ڈالنی چاہیئے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، کہ یہاں کی ہر اعلیٰ چیز اپنی ادنیٰ کو، اور ہر قوی چیز اپنی ضعیف شے کو جذب و ہضم کر جاتی ہے، اور اسی سے اس کی زندگی اور بقا ہے، چنانچہ جمادات نباتات کی غذا بنتے ہیں، اور نباتات حیوانات کی اور پھر حیوانات بھی حیوانِ اشرف یعنی انسان کی غذا کا کام دیتے ہیں، پس اسی طرح سے عالمِ ظاہر کا یہ سلسلہ قائم ہے، گویا نیٹشے کے الفاظ میں :-

"طاقتور چیزوں کی خدمت گذاری کے لئے کمزور چیزیں اپنے آپ کو ہر وقت آمادہ و مستعد پاتی ہیں، حالانکہ اس خدمت گذاری سے ان کا مقصد اپنے سے بھی زیادہ کمزور ہستیوں پر قدرت اور فوقیت حاصل کرنا ہوتا ہے" :

یہ ایک ایسی مسرّت ہے جس سے کوئی چیز بھی محروم رہنا گوارا نہیں کر سکتی اور جس طرح چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی حصولِ بقا کے لئے اپنے آپ کو نثار کر دینے کے لئے تیّار رہتی ہے، اسی طرح بڑی سے بڑی شے کو بھی اس ضرورت کی بجا آوری میں اپنا آپ قربان کر دینے سے ذرا بھی دریغ نہیں ہوتا!!

اور یہی بات مولانا روم بھی فرما چکے ہیں ع

جملہ عالم آکل و ماکول داں!

جب ظواہر اور محسوسات میں یہ قانون اپنی پوری طاقت سے جاری ہے،

توکیوں رُوحانی دُنیا میں بھی اس کے عمل کو تسلیم نہ کرلیا جائے، چنانچہ اسی خیال سے کہ انسانوں کے عقائد بھی اپنے ضعف وقوت کے اعتبار سے ایک دُوسرے کو جذب وہضم کرتے رہتے ہیں، ایک دُوسری جگہ فرماتے ہیں ع

پس معانی راچواعیاں حلق ہاست

اس قانون کے ظاہری عوامل سے گذر کر باطنی شواہد پر غور کیا جائے، تومعلوم ہوگا، کہ مرزا نے بھی اپنے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وُہ فرماتے ہیں، کہ توحید سے زیادہ یقینی اور پختہ مذہب چونکہ دُنیا میں اور کوئی ہو نہیں سکتا، لہٰذا اس کے علاوہ جتنی ملتیں بھی ہیں، وُہ انسانوں ہی کی ساختہ وپرداختہ ہیں، اور اُن کی تشکیل فقط رسوم وعادات سے ہوئی ہے، اس لئے وہ اپنی کمزوری اور ضعف کی بنا پر اسی ایک مرکز یعنی توحید ہی میں آکر فنا ہوتی، اور اسی کا جزو بنجاتی ہیں؛

اس فلسفیانہ انداز میں ملت وآئین کے تمام اجزائے باطلہ کو ایک ہی چیز یعنی دین حق میں تحلیل کرکے رکھ دینا مرزا جیسے شخص ہی کا حصہ ہوسکتا ہے!

پھر فرماتے ہیں کہ:

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مِٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

مشکلوں کو سہتے سہتے نتیجہ کار ان کا آسان ہوجانا بالکل نئی قسم کا استدلال ہے، قاعدہ ہے، کہ ایک چیز شروع شروع میں انسان کو بہت تکلیف دیتی ہے

لیکن جب انسان عادی ہو جائے، تو اس کا ذرا بھی احساس نہیں رہتا مرزا نے بھی "فلسفۂ غم" کے اسی دقیق نکتے کو ایک وجدانی انداز میں شعر کا جامہ پہنایا ہے!

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

فرماتے ہیں کہ انسان کے لطیف اور پاکیزہ جذبات و اعمال بغیر کشیدگی اور غفلت کے ہرگز فروغ حاصل نہیں کر سکتے، اور پھر اس مفہوم کو ایک نہائت بلیغانہ انداز میں اس طور پر واضح کیا ہے، کہ بادِ بہاری کا وہ صاف و شفّاف آئینہ جس میں، بجائے خود کوئی کثیف جزو موجود نہیں، اس وقت تک بالکل ناقص اور بے رونق رہتا ہے، جب تک کہ چمن کی رعنائی اور شوخی اسمیں جذب و کشش کا سامان پیدا نہ کر دے، گویا پھولوں کی رنگینی اور سبزے کی افراط اُس آئینے کے لئے بمنزلہ زنگار کے ہے، جو اُس کی غائتِ تخلیق کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے،

پس یہی ہیں، وہ متضاد کیفیتیں جنہیں صُوفیا کی اصطلاح میں بھی قبض اور بسط کے دو جامع الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہی ہے وہ احساس، جسے شعراء آمد اور آورد سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں!

مذہب میں یہی "کثافت" وہ لغزشِ مستانہ ہے، جس پر سے ہزاروں عبادتیں قربان، اس بنا پر میں کہوں گا، اور بلا خوفِ تردید کہونگا، کہ دُنیا میں گناہ کا عقیدہ بجائے خود کوئی حقیقت نہیں رکھتا، انسان زندگی کے

انہیں ادوار سے گزرتا ہوُا منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے، اس کی خامیاں حقیقت میں نیکیاں ہیں، جو اندر ہی اندر اس کی رُوحانی اور فطری قوتوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے درپے رہتی ہیں، متمدّن قومیں اپنے دورِ وحشت کی یادگار ہوُا کرتی ہیں، اسی طرح سمجھ لینا چاہیئے، کہ ترقی یافتہ افراد بھی بنات خود اپنے گذشتہ حالات و واقعات کا آئینہ ہیں، اگر انسان ذہن رسا اور فطرتِ سلیم رکھتا ہو، تو اُس کی "کثافت" بھی نتیجہ کار "لطافت" بن کر رہتی ہے!

کیا ہم ایک لمحے کے لئے بھی گناہ کو کوئی مستقل اور بامعنی لفظ تسلیم کر سکتے ہیں ؟ کبھی نہیں ! فطرت کا حاکمانہ اقتدار کسی حالت میں بھی اسکی تائید نہیں کر سکتا، اشیائے عالم کی تخلیق سے قدرت کا مقصد خیر ہے، شر ہرگز نہیں ! فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ اس بیان کی ایک واضح اور بیّن شہادت ہے، انسان کی تخمیر فی الحقیقت اسی پاکیزہ اور مقدّس احساس سے ہوئی ہے، اور یہ ایک ایسا دائمی اور ابدی قانون ہے، جسے رُوئے زمین کی کوئی طاقت کسی صُورت میں بھی متغیّر نہیں کر سکتی ؛ حق اُسی وقت فروغ پاتا ہے، جب اُس کے مقابلہ میں ایک باطل قوّت بھی موجود ہو :

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

(اقبال)

اور بقولِ میر :

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کیلئے
حسن زنّار ہے تسبیح سلیمانیؑ کا

— دنیا میں علم کی گرم بازاری اور قدر افزائی فی الحقیقت جاہلوں کی

عبرتناک حالت سے وابستہ ہے، یقین اُس وقت تک نہیں ہوا، جب تک اُس نے شک اور تذبذب کی ہولناک وادیوں میں ایک مدت تک ٹھوکریں نہیں کھائیں؛ رات کے وقت جگمگاتے ہوئے ستارے اپنے اندر بے انتہا کشش رکھتے ہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے، تو ان کی اس لطافت اور چمک دمک کو دوبالا کرنے والی چیز وہ تاریکی ہے، جس نے دُنیا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، جگنو اپنی خوبصورت روشنی کے ساتھ ہر وقت موجود ہے، لیکن اُس کی یہ چمک بھی بغیر اندھیرے کے دیکھی نہیں جا سکتی: اسی طرح سمجھ لیجئے، کہ نیکی اور بدی بھی دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اور زندگی کی ناگوار حالتیں ہمیشہ اس کے نقائص اور عیوب کو ایک مبہم اور نامعلوم طریق پر زائل کیا کرتی ہیں[1]!

---

[1] قرآن مجید میں اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ (نیکیاں بدیوں کو مٹا ڈالتی ہیں) اور پھر یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (خدا سلیم الفطرت انسانوں کے گناہوں کو بھی نیکیوں سے بدل دیا کرتا ہے) کا مطلب بھی سوائے اس کے اور کچھ نہیں، کیونکہ برائیوں کا نیکیوں سے بدل جانا یہی معنی رکھتا ہے، کہ اگر وہ شخص پہلے جھوٹ بولا کرتا تھا، تو اب ہمیشہ سچ بولیگا، یا پہلے وہ لوگوں کا مال ناحق طور پر غصب کیا کرتا تھا، تو اب صدقات و خیرات میں کثرت سے حصہ لیگا، پہلے کسی کو ایذا پہنچاتا تھا، تو اب اُس کی دلجوئی اور خدمت گذاری کو اپنی سعادت سمجھیگا، الغرض اس کی ہر نیکی اُس برائی کی ضد ہوگی، جو وہ پہلے کیا کرتا تھا، اور جب تک یہ تقید لازم نہ سمجھ لی جائے، اعمال کی تلافی خاطر خواہ طور پر ہو نہیں سکتی، کیونکہ آگ کو صرف پانی ہی بجھا سکتا ہے، کوئی اور چیز خاموش نہیں کر سکتی!

نیٹشے تو جملہ عالم اور اُس کی تخلیق کو بھی اسی معنوی تضاد کا مُوجب قرار دیتا ہے، اُس کے نزدیک بھی باطل کا وجود محض حق کو فروغ دینے کے لئے ہے، چنانچہ کس شعریت اور کس حسنِ انداز سے گویا ہے :-

"جب تخلیقی نظر سے میں نے دیکھا، تو خیر اور شر، خوشی اور غم، ہم اور تم ـــ غرضیکہ کائناتِ عالم کی جملہ اشیاء مجھے ایک رنگین غبار کی مثل دکھائی دیں؛ پھر ان تمام چیزوں کو وجود کا جامہ کس نے پہنایا؟ اور دُنیا کس طرح نمُودار ہو گئی ہے ـــ یہ صرف اس وقت تھا، جبکہ اُس پردہ نشین نے اپنی نیچی اور محجوب نگاہوں کو فضاؤں میں پھیل جانے کی اجازت دی"۔

اور آگے چل کر تو نہائت واضح طور پر کہتا ہے :-

"اے دوست! میں تجھ سے ہر برائی کی توقع رکھتے ہوئے ہر بھلائی کا طلبگار ہوں"۔

پھر اس باب میں ایک عامیانہ اور گمراہ کُن ذہنیّت کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"مجھے تسلی دینے کے لئے تمام داناؤں نے کہا، کہ انسان مجسّمۂ شر ہے، حیف ہے اُن کی دانشوری پر، اور افسوس ہے، اگر لوگ آج بھی اسے صحیح تسلیم کرلیں، اس لئے کہ تمہارے نزدیک جو شر ہے، میرے نزدیک وہی انسان کی تمام سعادتوں اور قوّتوں کا منبع و مخرج ہے"۔

اس کے علاوہ "جاوید نامہ" میں بھی خیر و شر کے اسی نازک اور تشویشناک

مسئلے کو جس خوبی سے زندہ رود شاہ ہمدان سے دریافت کرتا ہے، اور پھر اُس کی جانب سے اسپر جیسا تسلّی بخش اور عُمدہ جواب ملتا ہے، اس سے بھی میں ناظرین کو اس ضمن میں محرُوم رکھنا نہیں چاہتا،

فرماتے ہیں :۔

از تو خواہم سرِ یزداں را کلید | طاعت از ما جُست و شیطاں آفرید
زشت و ناخوش را چناں آراستن! [۱] | درعمل از ما نکوئی خواستن!
از تو پُرسم ایں فسُوں سازی کہ چہ! | با قمارِ بد نشین بازی کہ چہ!
مشتِ خاک و ایں سپہر گرد گرد | خود بگو می زیبدش کارے کہ کرد؟
کارِ ما افکارِ ما، آزارِ ما! | دست با دنداں گزیدن کارِ ما!

جواب ملاحظہ ہو :۔

بندۂ کز خویشتن دارد خبر | آفریند منفعت را از ضرر!
بزم با دیو است آدم را وبال، | رزم با دیو است آدم را جمال!
خویش را بر اہرمن باید زدن | تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن!
تیز تر شو تا فتد ضربِ تو سخت | ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت!

ابن آدم کی یہی غفلت، یہی سُست بنیادی، اور یہی تیرہ بختی ہی تو ہے جس پہ دُوسری جگہ ابلیس بھی ان الفاظ میں نالہ و فریاد کرتا ہے :۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب | من شدم از صحبتِ آدم خراب

---

[۱] اس کا مطلب یہ ہے کہ :۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٴ | باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت!

خاکش از ذوقِ اِبا بیگانۂ — از شرارِ کبر یا بیگانۂ

صیدِ خود صیّاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر!

از چنیں صیدے مرا آزاد کن — طاعتِ دیروزۂ من یاد کن

پست از و آں ہمّتِ والائے من — وائے من اے وائے من اے وائے من!

فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف — تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف

بندۂ صاحب نظر باید مرا — یک حریفِ پختہ تر باید مرا!

لعبتِ آب و گِل از من باز گیر — می نیاید کودکی از مردِ پیر!

ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است — مشتِ خس را یک شرار از من بس است

اندریں عالم اگر جز خس نبود — ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟

شیشہ را بگداختن عارے بود — سنگ را بگداختن کارے بود!

آنچناں تنگ از فتوحاتِ آدم [1] پیشِ تو بہرِ مکافاتِ آدم

---

[1] مطلب یہ کہ حضرتِ انسان کی حد سے بڑھی ہوئی غفلت اور معصیت نے مجھے بھی افسردہ اور مضمحل کر دیا، جو قوتیں مجھے نبرد آزمائی اور جنگ و جدل کیلئے عنایت کی گئی تھیں، وہ بیکار اور بے نتیجہ رہنے کی وجہ سے میرے لئے وبالِ جان ثابت ہو رہی ہیں، ایک طرف میں شاکی ہوں، تو دوسری جانب مجھے بھی شرمسار ہونا چاہیئے، کہ ایسی کمزور اور بزدل مخلوق کو میرے سامنے لا کھڑا کیا، جو ایک ضرب کی تاب بھی نہیں لا سکتی ہے۔

پس بحالت موجودہ میری التجا کو سُن، اور میری گذشتہ عبادت ہی کو یاد کرتے ہوئے مجھے اُس عذاب الیم سے نجات دلا، جو فی الحقیقت عذاب دوزخ سے بھی زیادہ دردناک ہے!!

منکرِ خود از تو مے خواہم، بدہ | سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم | لرزہ انداز د نگاہش در تنم
آں کہ گوید از حضورِ من برو | آں کہ پیشِ او نیرزم با دو جو

اے خدا یک زندہ مردے حق پرست
لذّتے شاید کہ یا بم در شکست

اب آپ شیطان کی اس آرزو کا حقیقی مدّعا بھی پہچانیئے، اور اس فلسفۂ خیر و شر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک دفعہ پھر غالب کی تمثیل پر بھی غور فرمائیے، کہ کس حسنِ انداز اور منتہائے بلاغت سے اس کا حق ادا ہوا ہے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی | چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

پس عملی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی ان تمام مباحث کا حاصل یہ ہوا کہ :-

مزی اندر جہانِ کور ذوقے | کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ | آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

یہ بھی طبیعیّات کا ایک مسئلہ ہے، اور تجربہ اس کا شاہد؛ جب کسی اندوہناک حادثہ سے انسان کی طبیعت بھر آئے، تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے، لیکن ایسی حالت میں اگر طبیعت پر جبر کیا جائے، اور دل کا غم آنکھوں کے راستے بہ نہ جائے، تو وُہی آنسو بعد کو ایک قیامت لاتے ہیں، سینہ اندر سے دُکھنے لگتا ہے، سانس رُک رُک کر آتا ہے، اور بعض

دفعہ تو مریضِ غم کا اسی کشاکش میں خاتمہ بھی ہو جاتا ہے!

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس — از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

اس شعر میں مرزا نے حیات بعد الممات کا فلسفہ بیان کیا ہے، مُرغی کا بچہ جب تک انڈے کے اندر رہتا ہے۔ اُس کے لئے ہلنے جُلنے یا پرواز کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور نہ ہی قدرت نے ہنوز اتنا سامان عطا کیا ہے، جو ایک غیر محدود پرواز کے لئے کافی ہو سکے؛ لیکن جونہی وُہ اس دُنیا کی ہوا کھاتا ہے، ساتھ ہی اُڑنے اور پرواز کرنے کی تمام قوتیں بھی خود بخود نشو و نما پانے لگتی ہیں، اور وُہ زندگی کی وُسعتوں سے جس طرح چاہتا ہے، لذّت یاب ہوتا ہے، اسی طرح یہ دُنیا بھی انسان کی فطری قوتوں کے لئے بالکل ناکافی ہے، رُوح جسم کے اندر چلّاتی اور نوحہ کرتی ہے، کہ اس محدود خاکدان سے میری تسکین نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے تو وُہ بلندیاں درکار ہیں، جن کا ذکر اقبال نے اپنے شعر میں کیا ہے:

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وُہ کارواں تو ہے!

اسی طرح ہنری وَیگن[1] بھی جب رُوحِ انسانی کے غیر فانی تاثرات کو محسوس کرتا ہے، تو اس کا سازِ دل بھی اپنی معصومیت سے ایسے ایسے پاکیزہ اور آسمانی نغمات پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہ فی الحقیقت انہیں الہامی چیزیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ کہتا ہے، اور کس والہانہ انداز میں

[1] انگلستان کا ایک مشہور اور بلند پایہ شاعر ۱۶۲۱ء میں پیدا ہوا ۱۶۹۳ء میں وفات پائی

کہتا ہے :-

"اے خدا! اے وہ خدا کہ جس کی روح نے تیرے حکم کے مطابق اپنی تیزی اور حدت سے پہلے پہل مردوں میں جان ڈالی، اور اس مرغی کی طرح جو اپنی شفقت اور محبت کے تقاضے سے متواتر اور مسلسل طور پر انڈوں کو سینچتی ہے: اپنے مقدس ہاتھ سے بنی آدم میں جان ڈالی، ـــ ہاں خاک کے اس پتلے میں حرکت پیدا کی، جو کسی زمانہ میں اپنے وجود، صورت یا نام تک سے آشنا نہ تھا![1]

اے رحم اور محبت کے مالک! کیا میں اب بھی تیرے پاؤں کی اس مقدس آواز کو اس روئے زمین پر سن سکتا ہوں، اور کیا تیری تجلیات اب بھی ہوس کی ان تاریکیوں میں رونما ہو سکتی ہیں ـــ کیا وہ روشنی ان مساجد میں بھی دکھائی نہ دیگی؟

اے خدا! کیا میں اپنی مبہم اور نامعلوم پرواز سے اس دن کو نہیں پا سکتا، جو ابھی تک تیرے انتظار میں ہے؟

اے سراپا روح! اے کہ جس کا عکس کائنات کے ذرّے ذرّے کو حاوی ہے، مجھے اپنے وصال سے مسرت اندوز فرما، مجھے اپنے رحم

---

[1] قرآن حکیم کی ایک آیت ہے: هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۚ یعنی: "انسان پر ایک ایسا وقت نہیں گذر چکا، جبکہ اس کی پیدائش کے متعلق کوئی سوال بھی نہیں اٹھایا گیا تھا"۔ فطرت انسانی نے یہاں بھی اس عالمگیر صداقت کو تسلیم کیا ہے ۱۲

اور بخشش کی وہ جھلک دکھا، جس کے لئے میں دن رات مضطرب رہتا ہوں، اور مجھے ان توہمات اور غم و اندوہ کی تاریک دنیا سے کھینچ کر خوشی اور اطمینان کے اس روشن اور وسیع جہان میں پہنچا دے، جہاں راحت اپنا بسیرا رکھتی ہے، اور جہاں زندگی کی کشاکش کو کوئی دخل نہیں!

ہاں، صرف اسی جگہ اور صرف اسی مقام پر مجھے پہنچ لینے دے، جہاں میں اپنے اس یوسف گم گشتہ کا سراغ لگا سکوں، اور اس مہکتے ہوئے پھول کو پالوں، جس کا فراق مجھے ہمیشہ خون کے آنسو رلاتا ہے،

اے غیر فانی زندگی کے مالک، اور اے اس تمام شان و شوکت کے آقا! جو تیرے عرش کے نیچے کار فرما ہے، اپنی اس روح پر جو اس قفس عنصری کے اندر نوحہ کرتے کرتے تھک گئی، رحم فرما، اور اس قید و بند سے رہائی عطا فرماتے ہوئے اس کو ایک ایسی زندگی سے مالا مال کر دے، جس کے لئے کوئی اختتام نہ ہو۔"

لیکن بایں ہمہ روح ہے کیا چیز؟ --- قرآن مجید تو ہمیں صرف اسی قدر بتلاتا ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ: "اے نبی! یہ لوگ آپ سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں، سو کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کا ایک حکم ہے۔" البتہ اس ضمن میں جو کچھ علامہ جلال الدین سیوطی نے فرمایا ہے، اُسے اس اجمال کی بہترین تفصیل کہنا چاہئے اور فی الحقیقت وہ ایک ایسی چیز ہے، جو اپنے فلسفیانہ انداز اور وجدانی خوبیوں کے پیش نظر اپنا ثانی نہیں رکھتی، غور سے ملاحظہ فرمائیے:-

فالرّوح جسمٌ حادثٌ نورانی   حیٌ خفیفٌ مسرعُ النسیان
ینفذ فی الاعضاء نفوذ النّار   فی الفحم او کالماء فی الاشجار

یعنی: "رُوح ایک ایسا جسم ہے، جو اپنی تقدّس اور نورانی کیفیات کی بنا پر مشاہدہ میں نہیں آسکتا، وُہ بجائے خود ایک ابدالآباد تک زندہ رہنے والی اور ہلکی پھلکی سی چیز ہے، لہٰذا مادیّات کے ساتھ اسے بہت کم وابستگی ہے، اس کا اعضائے انسانی میں حلول کرجانا بالکل ایسا ہی ہے، جیسے آگ کا کوئلوں کے اندر نفوذ کرنا، یا پانی کا درختوں اور بیل بوٹوں کے اندر جاری وساری ہونا"

شیلے نے بھی اس موضوع پر نہائت پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے، اور حق تو یہ ہے، کہ اس کا بیان بھی اپنی جدّت اور غزلیّت کے اعتبار سے مجھے بارہا وجد میں لے آیا ہے، رُوح سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"اے روح! تیرا جسم انسانی میں اس طور پر بسیرا کر لینا اپنے اندر ویسی ہی شعریّت، اور وہی سوز و گداز لئے ہوئے ہے، جو کہ خاموش اور سوئی ہوئی بجلیوں میں پایا جا سکے؛ جو راکھ کے اندر کسی چھپے ہوئے انگارے میں ممکن ہے؛ ہاں وُہی گرمی اور لطافت جو عشق اپنے کسی بچھڑتے ہوئے معشُوق کی آخری نگاہوں میں محسُوس کر سکے، اور وہی چمک جو کان کے اندر کسی روشن اور انمول ہیرے میں پائی جا سکے!"

تو معلوم ہوُا، کہ رُوح سراپا وجدان ہے، اک لطیف شعر ہے، اس لئے شاعرِ فطرت کے علاوہ کوئی دُوسرا شخص اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا، یہ محسُوس

اور مرئی نہیں، اور شعاع نظر کی مثل، گو اس سے انسان ہر طرح کی بصیرت اور شعور حاصل کرتا ہے، لیکن بذاتِ خود اسے دیکھ نہیں سکتا، اس مقام پر کیا ہی موزون شعر یاد آیا، ذوق کہتے ہیں:

اس سے دیکھا سبکو اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ   وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

حکمائے یورپ رُوح کو ایک سفید دھوئیں سے مماثل قرار دیتے ہیں یہ تشبیہ اپنی ہیئت کذائی اور فکر و نظر کی جستجو کو لحاظ رکھتے ہوئے کافی حد تک صحیح اور معقول تسلیم کی جا سکتی ہے؛ میں نے غور کیا، تو غالب کے تاثرات کو بھی اسی تھیوری کا مؤید پایا، وہ فرماتے ہیں:-

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے   ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

جونہی شمع بجھتی ہے، دھؤاں اک پُر کیف اور خمیدہ صورت اختیار کرتے ہوئے اُوپر کی جانب اُٹھتا ہے، لیکن نہیں معلوم کہ ہوائیں اُسے اپنی آغوش میں سنبھالے ہوئے کِس بہشتِ جاودانی، اور کِس فردوسِ بریں تک پہنچا دیتی ہیں!

دیکھ لیجئے، گوئٹے کا خیال بھی رُوح کو اسی حیثیت اور اسی تمثیل کے اندر پیش کرتا ہے، وہ کہتا ہے:-

"ایک جلتی ہوئی شمع خواہ کیسی ہی ہیئت رکھتی ہو، لیکن وُہ زیادہ دیر تک کسی بد وضع یا خلافِ حقیقت صورت پر قائم نہیں رہ سکتی اور نہ ہی اُسے اس خاکدان کے ساتھ دلی محبت ہے، اس کا شعلہ ہمارے دیکھتے دیکھتے زمین سے پرواز کرتا ہے، پھر نظر سے غائب

ہونے لگتا ہے، اور اسی طرح بالآخر اپنے اصلی مقام اور اپنی جائے پیدائش کو بھی پہنچ جاتا ہے۔"

بہاریہ

مرزا جیسے دقیق سے دقیق مضامین کو انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے ہیں، اسی طرح سبزۂ و بہار کے لطیف اور فرحت بخش تاثرات کو بھی نہائت دل کش انداز میں الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں دیوان میں متعدد جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں، ذیل میں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی
سبزۂ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشم نرگس کو دی ہے بینائی

بہار کی شوخی اور سبزۂ گل کی فراوانی اس سے بہتر الفاظ میں نہیں دکھائی جا سکتی، اور پھر لطف یہ ہے، کہ بہار کے تماشائی بھی مہر و مہ ہیں، جو انسانی تکلفات سے دور رہ کر خود اس کے حسن کو دوبالا کرنے والے ہیں، اسی طرح بہار کا نظارہ اس قدر مدہوش کن ہے، کہ اس کی دید کو نرگس کی آنکھ درکار ہے، جو کبھی جھپکنے نہ پائے، حالانکہ یہ بھی خود پھولوں ہی میں سے ایک پھول ہے، پس جو بڑی کیفیت اس بیان کے اندر ہے، وہ یہ کہ شاعر نے حسن و خوبی کے تمام اسباب نیچر ہی کی حدود سے مہیا کئے ہیں، اور کسی چیز کے لئے بھی باہر قدم نہیں رکھا،

اور پھر :-

ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف　　اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

گویا پھُولوں کا جال اس طور پر بچھ گیا ہے، کہ پرندوں کو بھی ایک شاخ سے اُڑ کر دُوسری شاخ تک جانا دشوار ہو گیا ہے، پھر فرماتے ہیں :-

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ　　اگر گُل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

کہتے ہیں، کہ اگر اس دفعہ پھولوں کی کثرت سے سرو بھی ایڑی سے چوٹی تک ایک رنگین پوشاک نہ پہن لے، تو سمجھ لینا چاہیئے، کہ گویا کچھ بھی پیدا نہ ہُوا تھا، یہ بھی قدرت کا ایک عجیب منظر ہے، اسی طرح :-

پُوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن　　سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہَوا موجِ شراب

فرماتے ہیں، کہ سرسبز درخت، اور چھوٹے چھوٹے بیل بوٹے، جو مستی کے عالم میں یُوں لہلہا رہے ہیں، گویا ایک رند، جو باوجود کوشش کے خود کو نہ سنبھال سکے، اور بار بار لڑکھڑاتا ہو، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انگُور کی بیل میں موجِ ہوا بھی موجِ شراب بن جاتی ہے، ! :-

گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں مُنہ چومنا
وُہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشہ کا سا عالم گلستان پر
(میر حسن)

شوخی اور ظرافت

مرزا کے کلام کا ایک خاص جوہر شوخی اور ظرافت

بھی ہے، لیکن نہ ایسی جو انشاؔء اور رنگینؔ کی طرح ہزل سرائی اور فحش گوئی کی صُورت اختیار کر لے، بلکہ اسمیں بھی ایک طرح کی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے، یہ ان کی ایک پیدائشی خصلت ہے، کہ بات کہتے ہیں، اور اس مزے کی کہتے ہیں، کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے، چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو :۔

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز دُعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

کہتا ہے، کہ ہم دعائیں کرتے کرتے عاجز آگئے، لیکن دل کا مدّعا پُورا نہ ہُوا، لہٰذا اب ایسی چیز کے لیئے دُعا کریں گے، جو پہلے ہی سے دی جا چکی ہو، یعنی بارگاہِ ایزدی میں التجا کریں گے، کہ "الٰہی! خضر کو عمرِ دراز عطا فرما۔"

ایک اور جگہ کہتے ہیں :۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

حشر کے میدان میں خدا کے سامنے کہتا ہے، کہ فرشتوں نے میرے متعلّق جو کچھ لکھا ہے، اُسے بغیر شہادت کے میں کیونکر تسلیم کر سکتا ہوں؟ اور پھر جب دیکھا، کہ یُوں بھی چھٹکارا نہیں ہوتا، تو ایک اور پھبتی سُوجھی، اور "برجستہ" کہہ گئے :۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ میں نے کیئے، ان کی سزا تو مسلّم، لیکن قدرت اور اختیار نہ رکھنے کی وجہ سے جن گناہوں کو میں عمل میں نہیں لا سکا تھا، اور دل کی دل

میں رہ گئی تھی، آخر ان کا بھی تو کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے !!

اسی مفہوم کو ایک اور شعر میں بھی ادا کیا ہے :

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

یہاں پھر بے اختیار خیّام کی وُہ رباعی یاد آتی ہے، کہ :-

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو　　آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو

من بد کنم و تو بد مکافات دہی　　پس فرق میان من و تو چیست بگو

حق تو یہ ہے، کہ جو شوخی اور برجستگی خیّام کی رباعی میں پائی جاتی ہے، وُہ غالب کے اشعار میں بھی نہیں، کہتا ہے: "بھلا بتلا تو سہی ! دنیا میں ایسا کون ہوگا، جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، اور جو شخص گناہ نہ کرے، وہ جیئے کیونکر؟ — میں نے تو برائی کی، لیکن تو بھی اس کا بدلہ برائی ہی سے دیتا ہے، (جب حالت یہ ہے) تو پھر میرے اور تیرے درمیان فرق کیا ہُوا ؟"

ایسی باتیں زیادہ تر شاعرانہ ناز و انداز کو مدّنظر رکھ کر کہی جایا کرتی ہیں، اور انہیں وُہی حیثیّت دینی چاہیئے، جو دو بے تکلّف دوستوں کی گفتگو کو دی جاسکتی ہے !

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے :

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین　　ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

یہاں بھی اسی طبعی ظرافت کا اظہار کیا گیا ہے، پھر زاہد کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد　　مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

اس کے بعد ایک اور حماقت پر تنبیہ فرماتے ہیں :۔

شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم　　آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

حضرت اکبر کا شعر بھی یہاں لطف سے خالی نہیں، وہ فرماتے ہیں:

کچھ شک نہیں کہ حضرت واعظ ہیں خوب شخص　　یہ اور بات ہے کہ ذرا بیوقوف ہیں

اس کے بعد مرزا اپنے معشوق سے محاسبہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں :۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا　　بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

یعنی ہم چاہیں تو کہہ کر بھی بتا دیں گے، کہ فی الواقع تم نے غیر کو بوسہ دیا ہے، یا آثار و علائم سے پتہ چلتا ہے، کہ تم اس خیانت کے مرتکب ہوئے ہو، اور ہم بحث کرنے پر آئے، تو اسے منوا کے چھوڑیں گے، مومن نے بھی اس مقام پر غضب کی شوخی دکھائی ہے، چنانچہ انہیں لطائف و ظرائف سے کام لیتے ہوئے دوست کو از راہ تشنیع کہتے ہیں :۔

میں ہی تو رہا ہوں کہیں شب کو خوش و خرم　　میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم

میری ہی نظر سے ہے عیاں نیند کا عالم　　آتی ہی جمائی پہ جمائی مجھے ہر دم

انگڑائیاں لیتا ہوں یہ اب میں ہی تو پیہم　　میرے ہی تو گردن میں پڑا جاتا ہے کچھ خم

میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے

میری ہی جبیں تو ہے جو گھٹنے پہ دھری ہے

میں ہی تو کہیں رات کو بیدار رہا ہوں　　میں ہی تو ہم آغوش طلبگار رہا ہوں

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا | جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا | شب درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اسکی | حسیں وہی ہے حقیقت زوال ہے جسکی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی | فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سنکر بتا دی شبنم کو | فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے | کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا | شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

محاکات محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طور پر ادا کرنا ہے، کہ اس شئے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، لیکن قبل ازیں کہ ہم مرزا کے کلام پر اس موضوع کے ماتحت بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ابتداءً چند نہائت ضروری اور اہم چیزوں کا ذکر کر دیا جائے، محاکات حقیقت میں فنِ شعر کا ایک رکن اساسی ہے، کلام کے محاسن اپنی صحیح شکل وصورت میں نمایاں نہیں ہو سکتے، تاوقتیکہ فلسفۂ محاکات پر ایک تفصیلی نظر نہ ہو جائے، ہمیں اس ضمن میں یہ بتانا ہوگا، کہ شعر اور محاکات کا آپس میں کیا ربط اور تعلق ہے، اور اس بنا پر ایک شاعر اور مصوّر میں کیا فرق ممکن ہو سکتا ہے؟

شعر میں سوز و اثر پیدا کرنے کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، ایک سبب ان میں سے یہ بھی ہے، کہ قدرتی طور پر جس واقعہ کے دیکھنے سے ہماری طبیعت پر جو اثر یا جو کیفیت طاری ہوئی ہے، اُسے اس

طریق پر بیان کریں، کہ نہ صرف اس واقعہ ہی کی ایک دلکش تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جائے، بلکہ جو چیزیں اس کے ماحول میں متعلقات اور عوارضات کی حیثیت رکھتی ہیں، وُہ بھی ایک ایک کر کے ہمارے سامنے آجائیں؛ جب شعر میں ان باتوں کا التزام کیا جائیگا، تو لازمی طور پر اس میں لطافت اور موسیقی کا پیدا ہو جانا بھی ضروری ہے،

ارسطوُ نے کتاب الشعر میں اس حقیقت پر جو توجیہ بیان کی ہے، اُس کا ماحصل بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"انسان میں نقالی اور محاکات کا فطری مادہ ہے، جانوروں میں یا تو یہ مادہ مطلق نہیں ہوتا یا ہوتا ہے، تو کم ہوتا ہے، مثلاً طوطی صرف آواز کی نقالی کرسکتا ہے، بندر حرکات، سکنات کی نقل اُتارتا ہے لیکن آواز سے کام نہیں لے سکتا، بخلاف اس کے انسان آواز سے اشارہ سے، حرکات سے، سکنات سے، اور اور مختلف طریقوں سے ہر چیز کی نقل اتار سکتا ہے۔"

"یہ بھی انسان کی فطرت ہے، کہ اس کو محاکات سے ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے، فرض کرو، اگر ایک بدصُورت جانور کی ہو بہو تصویر کھینچی جائے، تو ہر شخص کو لطف آئیگا، حالانکہ خود اس جانور کو دیکھنے سے طبیعت مکدر ہوتی، اس سے معلُوم ہوُا، کہ کسی شے کی محاکات خود لطف انگیز ہے، فی نفسہ وہ شے بُری ہو یا بھلی، اور چونکہ شعر بھی ایک قسم کی نقالی اور مصوّری ہے، اس لئے خواہ مخواہ اس سے

طبیعت پر اثر پڑتا ہے[1]

گویا ارسطو نے یہ ثابت کیا ہے، کہ انسانی شرف وفضل کی ایک بڑی وجہ واقعات اور احساسات کا صحیح طور پر "ادراک" کرنا ہے، اور دیگر حیوانات اس سے یکسر عاری ہیں؛ دُوسرے یہ کہ "محاکات" انسان کی "فطرت" میں داخل ہے، ظاہر ہے، کہ یہ دونوں چیزیں یعنی قوّتِ مدرکہ اور فطرت کا صحیح احساس، جب یکجا کر دی جائیں گی، تو شعر بھی اپنے زورِ اثر میں لاثانی ہوگا! اب اسی لحاظ سے ایک شاعر اور مصوّر میں جو فرق ہو سکتا ہے، اُسے بھی ملاحظہ فرما لیجئے؛ حق تو یہ ہے، کہ مصوّری بھی بجائے خود شاعری ہی کا ایک اہم جزو ہے، بلکہ جن واقعات کو ایک شاعر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کر سکتا ہے، مصوّر کا مُوقلم ان کی حق ادائی سے بالکل قاصر ہے، بالفاظِ دیگر یُوں کہنا چاہیئے، کہ ایک چیز کے مشاہدے سے بھی انسان پر وُہ کیفیّت طاری نہیں ہوتی، جسے شاعر اپنی سحر طرازی سے ایک نئی شان کے ساتھ ہمارے سامنے لاتا ہے، شاعری ایک وسیع قلمرو ہے، اور مصوّر کو اس کا ایک چھوٹا سا گوشہ دے دیا گیا ہے، اور بس! مصوّر کسی خاص واقعہ یا حالت کو جامۂ تصویر پر منتقل کر سکے، تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، لیکن جہاں تک جزئی اور فروعی کیفیّات کا بھی استقصاء کیا جا سکتا ہے، مصوّر کو آپ بالکل اپاہج پائیں گے؛ بخلاف اس کے شاعر ایک ایک چیز اور اس چیز کی ایک ایک باریکی اور نزاکت کو بھی انتہائی خوش اسلوبی سے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے،

[1] شعر العجم جلد چہارم صـ۹۷ از مولانا شبلی نعمانی (رحمۃ اللہ علیہ)

مثال کے طور پر جب ہم ایک مصور کے سامنے اس شعر کو پیش کریں :-

ہے چشم نیم باز عجب خوابِ ناز ہے　　فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

تو وہ بسہولت تمام محبوب کی اس خاص حالت اور پوزیشن کو اچھی تصویر پر منتقل کریگا، لیکن جب آپ اسی کے سامنے میر انیس کا یہ بند پیش کریں :-

وہ دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند　　دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند　　چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

— تو وہ آپ کا منہ تکنے لگے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے، کہ میں گھوڑے کی تصویر تو کھینچ سکتا ہوں، لیکن اس میں یہ مختلف کیفیات پیدا نہیں کر سکتا جنہیں شاعر نے ماحول کے تمام حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے، گھوڑے کا پیاس کی شدت سے پانی کو دیکھ کر بے اختیار ہنہنانا، پھر اس اضطراب اور تشویش کی حالت میں جسم کے ایک ایک عضو کا سمٹنا، اور کانپنا، پھر پانی کی آواز سن کر اپنے سوار کی طرف دیکھنا، اور اس طرح سے اپنی بے زبانی پر لاچاری کا اظہار کرتے ہوئے رحم و شفقت کی التجا بھی کرنا؛ تمام ایسی دل کش اور موثر باتیں ہیں، کہ شاعر کے سوا کوئی اور شخص انہیں ادا نہیں کر سکتا!

یا مثلاً متاخرین میں سے ایک شاعر سیر کہسار کی تصویر یوں کھینچتا ہے:-

درحقیقت ہے عجب لطفِ سیرِ کوہسار　　جس کے ہر نظارے پر صد فوقِ جنت ہے نثار

ایستادہ ہیں کروڑوں اک طرف سالکھو کے پیڑ　　گر رہے ہیں دوسری جانب ہزاروں آبشار

دیکھتا کیا ہوں کہ صد ہا چشمہ ہائے کوثری　　سنگلاخوں پر ہیں کرتے اپنی ہستی کو نثار

اک طرف سر آسماں چھائی ہیں صد ہا چوٹیاں　　دوسری جانب نظر آتے ہیں خشتناک غار

رستمِ دوراں بھی ان غاروں کو گر دیکھے کبھی　　کیا عجب ہے خوف سے آجائے اسکو بھی بخار

یا نہ جو اسکے ہی انہیں کچھ عجب ال بستگی　　یعنی اٹھتی ہیں اسی جانب یہ نظریں بار بار

تحتِ کوہ کی طرف دیکھو کہ کس انداز سے　　باغباں قدرت کا دکھلاتا ہی پھولوں کی بہار

نرم نازک ڈالیوں پر انسے بھی نازک ہیں برگ　　اور ان پتوں کی نوکیں کسطرح ہیں قطرہ بار

کسقدر دلچسپ تھا نظارہ ہنگامِ سفر　　اونچی اونچی چوٹیوں پر لہلہاتے مرغزار

ایکجانب اٹھ رہا ہی قلّہائے کوہ سے　　کسقدر آہستہ آہستہ یہ نورانی غبار

رفتہ رفتہ چھپا گیا اطرافِ وادی میں دھواں　　اور پھر پڑنے لگی چاروں طرف ہلکی پھوار

اسکو میں ناحق دھواں کہتا ہوں ہے تو اصل میں　　کوثرِ مواج ہے یا جوئے شیریں کی ہی دھار

یا کہ ابنائے زمانہ کی زبونی دیکھ کر　　قلب سے اشجارِ صحرا کے یہ نکلا ہے بخار

یا کہ آہیں مجتمع فرقت کی ماری ہیں یہ　　جا رہی ہیں بہرِ عرضِ حال سوئے کردگار

یا نظر بازوں کی نظروں سے بچانے کیلئے　　حسنِ کوہی پر یہ پردہ کھچ رہا ہے بار بار

الغرض جو کچھ بھی ہو یہ ہے بہت دلچسپ چیز　　دیکھنا اب رفتہ رفتہ ہو رہا ہے کم غبار

جسقدر کم ہوتا جاتا ہی یہ نورانی دھواں　　بس اسی نسبت سے ظاہر ہو رہے ہیں سب ابھار

جسطرح تصویرخانے میں مصور کی پلیٹ　　اپنی جزئیات کا کرتی ہی تدریجی ابھار

بس اسی صورت سے جتنا ابر ہے کم ہو رہا　　آ رہے ہیں پھر سے پیشِ نظر کوہی سنگار

اب آپ ہی انصاف فرمائیے، کہ مصوّر اس منظر میں وُہ تنوّع کہاں پیدا کر سکتا ہے، جو ایک شاعر نے کیا بعد دیگرے ایک ایسا سٹیج قائم کیا گیا ہے، جو ہر مابعد کی چیز کا از خود پتہ دیتا ہے!

پس شاعر کے حق میں یہی ممتاز خوبیاں ہیں، جن کی بنا پر جارج میکڈانلڈ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"مجھے تصاویر دیکھنے کے شیشے جادو معلوم ہوتے ہیں، میرے خیال میں سب سے نفیس وُہ کیمرہ ہے، جس کی تصویر کسی شاعر نے اپنے جادو بیان قلم سے کھینچی ہو۔"

پھر واقفکار لوگوں سے مخفی نہیں، کہ گوئٹے کا بھی اٹلی کے کھنڈرات کو دیکھکر یکایک متاثر ہونا، اور موقلم کو چھوڑ کر اپنے شاعرانہ قلم کو جنبش دینا بھی انہیں وجوہات کی بنا پر تھا، کیونکہ اُس نے باالآخر اس حقیقت کو پا لیا تھا، کہ شعر جن چیزوں کی ترجمانی کر سکتا ہے، تصویر اُن کا عشرِ عشیر بھی بروئے کار نہیں لا سکتی!

اس کے بعد لارڈ مکالے نے جو کچھ اس بارے میں تحریر کیا ہے، وُہ بھی سراسر انصاف اور حقیقت پر مبنی ہے، چنانچہ وُہ لکھتے ہیں:۔

"شاعری جیسا کہ دو ہزار برس پہلے[ل] کہا گیا تھا، ایک قسم کی نقالی ہے، جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بُت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے، مگر مصوّر بت تراش، اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسی قدر کامل تر

ل ارسطو کے قول کی طرف اشارہ ہے، ۱۲

ہوتی ہے، شاعر کی کل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے پرزوں سے، اور الفاظ ایسی چیز ہیں، کہ اگر ہومر اور شیکسپیئر جیسے صناع بھی ان کو استعمال کریں، تو بھی سامعین کے متخیلہ میں اشیائے خارجی کا ایسا صحیح اور ٹھیک نقشہ نہیں اُتار سکتے، جیسا مُوقلم اور چھینی کے کام دیکھکر ہمارے خیال میں اُترتا ہے، لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بُت تراشی، مصوّری، اور ناٹک یہ تینوں فن اس کی وُسعت کو نہیں پہنچ سکتے، بُت تراش فقط صُورت کی نقل اُتار سکتا ہے، مصوّر صُورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے، اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اس کے لئے الفاظ مہیّا کر دیئے ہوں، صُورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے، مگر شاعری باوجودیکہ اشیائے خارجی کی نقل میں تینوں فنوں کا کام دے سکتی ہے، اس کو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہے، کہ انسان کا بطون شاعری ہی کی قلمرو ہے، نہ وہاں مصوّری کی رسائی ہے، نہ بُت تراشی کی، اور نہ ناٹک کی، مصوّری اور ناٹک وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اس قدر ظاہر کر سکتے ہیں، جس قدر کہ چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں، اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے ان کیفیات کے ہوتے ہیں، جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں، مگر نفسِ انسانی کی باریک، گہری، اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں، شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے؛ عالمِ محسوسات،

دولت کے انقلاب، سیرت انسانی، معاشرتِ نوع انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں، اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیاء کے اجزاء کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے، سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں، شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے، جس قدر خیال کی قلمرو [1]"

محاکات کے موضوع پر اس بیان کی جامعیت ظاہر ہے، شعر کی وسعت اور شاعری کے ممکنات کو اس مقصد کے لئے بے نہایت تسلیم کیا گیا ہے، اسی طرح مولانا شبلی بھی ایک جگہ ان خیالات کا تجزیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے، کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے، اس کا ایک ایک خط و خال دکھایا جائے لیکن شاعر اکثر حالات میں محض ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے، جن سے صرف ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے، یا ان کو دھندلا رکھتا ہے، کہ اثر اندازی میں اُن سے خلل نہ آئے۔"

اس ابتدائی تقریر کے بعد اب ہم دکھلانا چاہتے ہیں، کہ انہیں صفات اور خصوصیات کی روشنی میں مرزا نے کس خوبی سے اپنے کلام میں محاکات کا حق ادا کیا ہے، مثال کے طور پر جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے :-

---

[1] مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۴۰

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں ‏ بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تو تصوّر گوش آشنا ہوتے ہی اوّل درِ دنداں اور لبِ مرجاں کا نقشہ کھینچتا ہے، پھر مسی کی اداہٹ اور پان کی سُرخی کے ساتھ ان میں تبسم کا رنگ بھرتا ہے، پھر رونگاری میں مشغول ہوتا ہے، اور سرمہ کی تحریر اور قشقہ کی لکیر تک بھی نہیں بھولتا، اور پھر گردن کے اتار اور سینہ کے خطوط کی کشش سے پیکر تیار کرتا ہے، اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ دستِ حنائی میں جو پردہ ہے، وہ بھی، اور جس غرفہ میں وہ پردہ آویزاں ہے، اس کو بھی دکھاتا ہے: اسی طرح دیگر اشعار بھی دیکھ جائیے:۔

پرسش طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے ‏ اُسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کی وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے ‏ آئے وہ یاں خدا کرے پہ نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے ‏ سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے رُوبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے ‏ اسکی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدّعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی ‏ سنکے ستم ظریف نے مجکو اُٹھا دیا کہ یوں

ان میں سے ہر شعر ناز اور شوخی کی تصویر ہے، ردیف اگرچہ سب کی ایک ہے، لیکن شاعر نے اس "یوں" میں بھی ہر جگہ ایک نئی کیفیت اور نیا انداز رکھا ہے، ہر شعر بجائے خود ایک بہترین مرقع ہے، اور حسن و عشق کے راز و نیاز کو نہائت دلکش پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے، آخری شعر ہی کو دیکھئے، کہ معشوق کی شوخی اور "ستم ظریفی" کو کس انداز سے دکھایا ہے، عاشق جب دوست کی محفل میں کسی غیر کو بھی دیکھ پاتا ہے، تو اُسے یہ منظر سخت

ناگوار گذرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ اسے یہاں سے نکال دینا چاہیئے، محبوب اسے
جان بوجھ کر کسی اور معنی پر محمول کرتا ہے، اور اس تجاہل عارفانہ کی رُو سے خود
معترض کو اپنی بزم سے نکال باہر کرتا ہے، کہ سوائے تیرے یہاں اور کونسا شخص
غیر ہو سکتا ہے؛ کیا یہ حسن کی شوخی اور ناز و ادا پر ایک بہترین تصویر نہیں ہے؟
مانی اور بہزاد کا قلم بھی ان چیزوں کو دیکھکر شکست کھانے لگتا ہے، اسی
طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں :

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

گویا عاشق اس بات کا منتظر تھا، کہ محبوب کی طرف سے کب حکم صادر ہوتا
ہے، کہ ہم اس کے دروازہ پر اپنا ڈیرہ جمائیں، لیکن محبوب کی شوخی دیکھئے، کہ
ادھر اجازت دی، اور اُدھر جب دیکھا، کہ یہ بوریا بستر بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے،
تو جھٹ انکار کر دیا، اور پھر انکار بھی ایسا کہ بستر کے کھُلتے کھلنے اپنے حکم کو
بلا رعائت واپس بھی لے لیا گیا؛ معشوق کا اجازت دینا، عاشق کا خوشی کے
مارے پھُولے نہ سمانا، اور جھٹ اپنے لپٹے ہوئے بستر کو کھولنا، اور پھر دوبارہ
معشوق کا انکار کر دینا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اور اس طرح سے اپنے عاشق کی
امیدوں اور آرزوؤں کو حسرت اور مایوسی سے بدل دینا؛ تمام ایسی باتیں ہیں
جنہیں شاعر ہی کا قلم زیبِ قرطاس کر سکتا ہے!

محاکات میں بعض اوقات **حذف** بھی بڑا لطف دے جاتا ہے، مثلاً
مرزا کا ایک اور شعر ہے :

گدا سمجھ کے وُہ چپ تھا مری جو شامت آئی اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیئے

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

پھر خدا خدا کر کے جب قاصد آ پہنچتا ہے، اور وہ محبوب کا خط اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، تو کس طرح وہ اس پر مطمئن نہ ہوتے ہوئے اس کو بدگمانی اور تجسس کی نگاہوں سے دیکھتا ہے :-

دیکھے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

حالانکہ اس کا منہ دیکھنا محض اس وجہ سے تھا، کہ اس کے چہرہ پر، جو ہجر کی اذیت سے مرجھا کر زرد ہو چکا ہُوا تھا، خط کے موصول ہونے پر تازگی، اور فرحت و انبساط کے آثار بھی نمایاں ہوئے ہیں، یا نہیں، پھر کس طرح وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس خط کو کھولتا، اور امید و بیم کی چند لڑکھڑاتی اور بھٹکتی ہوئی نگاہوں سے اس کو دیکھتا ہے، پھر یہ نگاہیں کس طرح اُن آنسوؤں سے، جو فرطِ محبت سے مجبور ہو کر آنکھوں کی طرف اُمنڈ آئے ہوں، چھن چھن کر صفحۂ قرطاس پر پڑتی ہیں، جیسے ماہتاب کی کرنیں کسی چشمۂ کوثر بن سے گذر گذر کر ایک جنت آباد کئے دیتی ہوں، یا جس طرح شفق کی روشنی بادلوں کے نقاب کو چاک چاک کرتی ہوئی شام کی خاموشی میں ایک رنگین اور فرحت انگیز منظر پیدا کئے دیتی ہو، اور پھر کس طرح آہوں کا یہ سرد پنکھا اپنی ہلکی ہلکی جنبش سے طبیعت کی اس گرمی اور بے قراری کو آہستہ آہستہ فرو کرتا ہے، جسکو شاعر نے :

ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہُوا

سے یاد کرتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کیا، پھر کس طرح وہ اس خط کو

بے اختیار چومنا، آنکھوں سے لگاتا، اور دل کی تسکین کے لئے بار بار اُسے اپنے سینہ پر رکھتا ہے، پھر کس طرح اس کو چوری چھپے ایک ایک کونے میں بیٹھا ہوا پڑھتا، اور پڑھ کر ہر دفعہ ایک نئی حلاوت محسوس کرتا ہے، پھر کس طرح اس کو ایک معطّر اور خوبصورت رومال میں لپیٹے ہوئے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، سفر میں حضر میں، غرضکہ ہر وقت اور ہر حالت میں اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے، گویا ایک سانس بھی اس کے بغیر جی نہیں سکتا، اور گنج شائگان کے عوض بھی اس کو بیچ نہیں سکتا، — ماقبل اور مابعد کی یہ تمام کیفیات صرف اسی ایک شعر کے اندر فراہم کر دی گئی ہیں!

ایسطرح کانٹ دو کلیس کی رائے ہیں:

"بہترین شعر وہ ہے جس کے مضمون کو مصوّر بلا دقت صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کر سکے، اور جو حالتِ خواب تصویر میں قائم تھی وہ بیداری سے مبدّل نہ ہو"

— تو گویا اس تعریف کے مطابق شعر میں یہ خصوصیت ہونی چاہیئے، کہ فرشتوں کے نورانی اور غیر مرئی اجسام کی مثل شعر اگرچہ اپنے عوارضات اور لطائف کو ایک دھندلکے میں رکھتا ہو، لیکن روحانی اور فطری تاثرات کی بنا پر اس میں کسی طرح کی کمی نہیں ہونی چاہیئے، اس معیار پر دیکھا جائے، تو مرزا کے یہ چند اشعار لاثانی ہونگے :-

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

پیدا نہیں ہوتا، وُہ مغز نکالتا ہے، اور پوست پھینک دیتا ہے، اس کی نظر ہمیشہ اشیاء کی رُوح پر پڑتی ہے، اس لحاظ سے وہ معنوی دنیا کا خلاق ہی نہیں، بلکہ پروردگار بھی ہے، بایں ہمہ اسپر "ریزہ خیالی" کا الزام عائد کرنا ظلم اور نا انصافی کی انتہا ہے،

ہم اس مطلب کو واضح کرنے کے لیئے ذیل میں چند مثالیں نقل کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا، کہ شاعر کا تخیّل ایک ہی چیز میں کیا کیا معجزات پیدا کرسکتا ہے :-

پھُول ایک ہی چیز ہے، لیکن دیکھئے، کہ اس سے زندگی کی بے ثباتی پر کس کس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے، غالب فرماتے ہیں :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یہاں جب شاعر نے لالہ و گل کو دیکھا، تو اُسے خیال ہُوا کہ زمین جس میں لاتعداد حسین خاک سے مل کر خاک ہو چکے ہیں، شائد انہیں کو دوبارہ ان خوشنما اور شوخ و رنگین پھولوں کے لباس میں ہمارے سامنے لا رہی ہے؛ ظاہر ہے، کہ یہ بجائے خود "حسنِ تخیّل" اور "حسنِ تعلیل" کی ایک نہائت اچھی مثال تھی، اسی طرح جب وُہ بہت سے پھُول اور غنچوں کو باغ میں دیکھتا ہے تو اُس کا تخیّل فوراً ایک نئی صُورت اختیار کرتا ہے، اور وہ کہتا ہے :-

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے
(غالب)

یعنی غنچہ اگرچہ عدم سے عالمِ ہست و بُود میں ابھی نہیں آیا ہے، لیکن

اس کی شکل و ہیئت بتلاتی ہے، کہ وہ پھول کی پژمردگی اور ناپائداری پر ایک عالم حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوا ہے، اور خیال کرتا ہے، کہ جہاں کی زندگی ایسی بے مقدار ہو، وہاں میں جا کر کیا کرونگا، اسی طرح سوداؔ کا ایک شعر ہے :-

بھلا گل تو تو ہنستا ہی ہمارے بے ثباتی پر ۔ بتا روتی ہے کس کی ہستی موہوم پر شبنم

شاعر کے تخیل نے پھول کے کھلنے کو اس بات پر محمول کیا، کہ وہ ہماری بے ثباتی پر ہنس رہا ہے، لیکن جب اسی پر شبنم کے قطرات دیکھے، تو انہیں آنسوؤں سے تشبیہ دیتے ہوئے پھول کے اس فعل کو باطل قرار دیا، لطف یہ ہے، کہ ایک ہی چیز سے دو متضاد باتیں، ہنسنا اور رونا ثابت کر کے دکھا دیں!

اسی طرح اقبالؔ کا ایک شعر ہے :-

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اسطرح
دست طفل خفتہ سے رنگیں کھلونے جسطرح

یہاں بھی اگرچہ زندگی کی بے ثباتی کو ظاہر کیا گیا ہے، لیکن شاعر کے تخیل نے حسن تشبیہ میں انتہا درجے کا لطف و اثر پیدا کر دیا ہے، کہ شعر سے ایک طرح کی معصومیت ٹپکتی ہے، تشبیہ مرکب تشبیہ مفرد سے ہمیشہ بلیغ اور نادر تر ہوا کرتی ہے، اسی طرح جب شاعر پھول کو محبوب کے حسن سے منطبق کرتا ہے، تو اس سے جو جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں، انہیں بھی ملاحظہ فرمائیے، اقبالؔ کا ایک

شعر ہے :-

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

یہاں شاعر نے جب پھول کو سطح آب پر جھکا ہوا پایا، تو اسی سے ایک حسین کی شوخی ادا کی طرف تخیل نے رہنمائی کی، کہ گویا وہی آئینہ سامنے رکھے اس میں اپنا عکس دیکھ رہا ہے، اسی طرح میر سوز کا ایک شعر ہے :-

دعوٰی کیا تھا گل نے اس رخ سے رنگ وبو کا ۔۔۔ ماریں صبا نے دھولیں شبنم نے منہ میں تھوکا

یہاں شاعر حسنِ محبوب کی فوقیت اور برتری ظاہر کرنا چاہتا ہے، صبا کے جھونکوں سے گل کی ٹہنی کو ہلتا ہوا پایا، تو خیال کیا، کہ یہ متواتر ضربات ہیں، جو محبوب کے سامنے دعوائے جمال کرنے کی وجہ سے پھول پر بطور سزا پڑ رہی ہیں، اور پھر اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ شبنم کو تھوک کے چھینٹوں پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لئے ایک اور تحقیر ثابت کردی، لطائف حسیہ اور بلندئ تخیل کی یہ بہترین مثالیں ہیں، اسی انداز پر میر کا بھی ایک شعر ہے :-

کیا خوبی اسکے منہ کی اے غنچے نقل کرئیے ۔۔۔ تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے واں سے

شعراء معشوق کے دہن کو بوجہ تنگی غنچے کے ساتھ تشبیہ دے لیا کرتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں معدوم ہونے کی حیثیت سے یہی تشبیہ اس کے لئے موزوں ہے، اس شعر میں غنچے کے چٹکنے کو اس

کے بولنے سے تعبیر کیا گیا ہے، ظاہر ہے، کہ جب وہ کھلیگا، تو اس سے بو بھی لازمی طور پر چاروں طرف پھیلے گی، اب شاعر نے ایہام کے طور پر "دہن" کے ساتھ صرف "بو" کا ذکر کیا ہے، جو اپنے معنی اور قرینے کے لحاظ سے ایک نہائت ناگوار صورت کا نام ہوگا؛ حالانکہ دیکھا جائے، تو یہ حقیقت میں خوشبو ہے، لیکن معشوق کے دہن کی خوشبو اور رنگینی اس قدر بڑھی ہوئی ہے، کہ پھول کی بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں؛ مرزا **غالب** کہتے ہیں :-

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آجتک　　بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

شاعر نے جب گلزار میں پھولوں کو یکے بعد دیگرے اس سرعت کے ساتھ کھلتے ہوئے دیکھا، تو خیال کیا، کہ یہ معشوق کے دیکھنے کو اس طرح دوڑے چلے آتے ہیں، اور ان میں سے ہر پھول کوشش کرتا ہے، کہ میں اس کے دیدار میں دوسروں پر سبقت لے جاؤں،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے　　ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

یہاں غنچہ نہیں کھلا، گویا محبوب کے شوق میں اس نے اپنے بازو بے اختیار پھیلا دیئے ہیں، ایک اور مقام پر کہتے ہیں :-

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

یہاں پھولوں کے ہنسنے کو بلبل کی وارفتگی اور بے تابی کا سبب قرار دیا، اور تخیل نے حسن و عشق کے باہمی تعلقات پر ایک اور نتیجہ استخراج

کیا ہے، پھر کہتا ہے :

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دِل　　　گم کیا ہُوا دیکھا خوں کیا ہُوا پا یا

اس جگہ شاعر پھُول کو کھلتے ہوئے دیکھتا ہے، تو خیال کرتا ہے، کہ یہ شائد میرا ہی دل ہے، جسے میں ایک مدت سے کھو بیٹھا تھا، اور جسے کسی کی جفا کاری اور بے رحمی نے زخمی کر دیا ہُوا ہے!

اب اس حیثیت سے بھی قطع نظر دو ایک مثالیں اور ملاحظہ ہوں، آتش کا ایک شعر ہے :-

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف　　　قاروں نے راستہ میں لٹا یا خزانہ کیا؟

پھول میں جو زرد رنگ سا ریزہ ہوتا ہے، اُسے "زرِ گل" کہا کرتے ہیں، شاعر کی نظر جب اس پر پڑی، تو سمجھا کہ "قارون" جو خزانے سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا تھا، شائد اسی نے اب اپنی فیّاضی اس قدر عام کر دی ہے، کہ پھُول بھی زمین سے مالا مال ہو کر نکلتا ہے،

اقبال کہتے ہیں :-

سُورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو　　　طشتِ اُفق سے لیکر لالے کے پھول مارے

شام کو ایک دلہن قرار دیا ہے، جس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا ہو پھر فرماتے ہیں، کہ سُورج کے غروب ہوتے وقت کنارِ آسمان پر جو شفق پھیل جایا کرتی ہے، اس سے لالے کے چند پھُول لے کر اس دلہن کو ہنسی اور تمسخر کے طور پر مارے گئے، یہاں تخیل نے ایک خارجی چیز سے پھُول لئے اور لے کر کس خوبی اور رعنائی سے انہیں استعمال میں لایا!

یہاں تک پھول کے متعلقات سے بحث کی گئی، اب اسی تنوّع کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہلال پر دو ایک شعر پیش کئے جاتے ہیں، علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ‌ ‌ ‌ ‌ ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب ‌ ‌ ‌ ‌ نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب؟

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی؟

نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟

پہلے شعر میں تخیل نے ماہِ نو کو اس ٹکڑے سے مشابہ قرار دیا ہے، جو خورشید کی ڈوبتی ہوئی کشتی سے ٹوٹ کر سطحِ آب پر تیرتا ہوا رہ گیا ہو، دوسرے شعر میں پھر اسی ٹکڑے کو ایک نشتر سے تعبیر کیا ہے، کہ اس نے آفتاب کو، جس کا چہرہ صفراء کی وجہ سے زرد ہو چکا تھا، فصد کیا اور کرتے ہی اس کا خون آسمان پر پھیل گیا؛ تیسرے شعر میں پھر وہی نشتر ایک بالی قرار پائی، جسے آسمان نے شام کی دلہن سے چرا لیا ہو، اور پھر نیل کے پانی میں وہی بالی چاندی کی ایک خوبصورت مچھلی بن گئی ہے!

یہ تمام تشبیہات اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن اسی پر شاہ نصیر کی ایک تشبیہ بھی ملاحظہ فرمائیے، آپ ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے، اور کچھ زنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے، تحصیلدار نے کہا، کہ ان زنگتروں کی حسنِ تشبیہ میں کوئی شعر

ارشاد فرمایئے، اُسی وقت رباعی کہی اور سنائی :-

اے نیرِ برجِ آسمانِ اقبال — ان زنگتروں پر غور ہی کبھی گا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر — پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

اسی طرح شاعر جب ھلال سے ملتی جلتی چیز جگنو کو رات کی تاریکی میں کہیں دیکھ پاتا ہے، تو اس کی چمک بھی تخیل میں یہ تیزی اور سرعت پیدا کرتی ہے، کہ وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے :-

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں؟
آیا ہے آسماں سے اُڑکر کوئی ستارہ — یا جان پڑگئی ہے مہتاب کی کرن میں؟
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا؟ — غربت میں آکے چمکا، گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟ — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں؟

حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی ؟
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

اسی طرح موج دریا ایک ہی چیز ہے، لیکن اس پر بھی شاعر کا تخیل جو جو نیرنگیاں پیدا کرسکتا ہے، اُس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو، میر انیس فرماتے ہیں:-

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی — ساحل سے سر ٹپکتی تھیں موجیں فرات کی

موجوں کا ساحل سے سر ٹکرانا فی الحقیقت اس تلاطم کی وجہ سے ہے، جو روانی کے وقت لہروں میں پیدا ہو جایا کرتا ہے، لیکن شاعر نے "حسنِ تعلیل" سے کام لے کر اس کا سبب یہ تبلایا، کہ اہل بیت چونکہ کئی روز سے پیاسے تھے، اور انہیں پانی کہیں بھی میسر نہیں آیا تھا، اسلئے

موجیں ان تک پہنچنے کے لئے مضطرب اور بے قرار ہو رہی ہیں،

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب   اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

ظاہر ہے، کہ یہاں بھی اسی حسنِ بیان اور حسنِ انداز سے کام لیا گیا ہے لڑائی اس زور کی ہوئی کہ موجیں بھی خوف سے تھرتھرانے لگیں، حباب ادھر جنگ کا یہ تماشا دیکھتے اور اُدھر فوراً ڈر کے مارے پانی میں غوطہ لگا لیتے تھے؛ اقبال کا ایک شعر ہے :-

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ   پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

یہ بھی حسنِ تعلیل کی ایک بہت اچھی مثال ہے، یہاں موج کا اٹھنا سیرِ کہسار کے لئے ہے، اسی طرح موج کی اس حرکت کو شاعر کے تخیل نے جب مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا تو کہا :-

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں   موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

موج اُسی وقت تک موج ہے، جب تک اُسے دریا کے ساتھ پیوستگی حاصل ہو، لیکن جونہی یہ رشتہ ٹوٹا، تو پھر وُہ بھی ایک بے حقیقت سی چیز رہ جائے گی، اسی طرح فرد کی عزّت بھی ملت کے نظام پر موقوف ہے!

پھر جب اسی موج کو علائق دنیوی اور عوارضاتِ انسانی پر قیاس کیا گیا، تو تخیل نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا :-

کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی   (غالب)

یعنی موج جس قدر بھی قیدِ ہستی سے رہائی پانے کی کوشش کرتی ہے، اُسی قدر خود اُس کی رفتار ہی اس کے پاؤں میں بیڑیاں جکڑ دیتی ہے، یہی حال غریب انسان کا ہے، کہ وُہ دنیا کے جھگڑوں سے جتنا بچکر دامن سمیٹ کر چلتا ہے، اُسی قدر یہ خار دار جھاڑیاں اُسے اپنے قابُو میں لے آتی، اور آگے بڑھنے سے باز رکھتی ہیں!

اس کے بعد جب شاعر نے موج کو عملی اور اخلاقی حیثیت سے مفید پایا، تو اس سے ایک اور بات استنباط کی،

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدمِ ماست　　زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیریم

موج اسی وقت تک زندہ ہے، جب تک وُہ متحرک بھی ہے، لیکن جونہی وُہ اس جدّ و جہد سے دست بردار ہوئی، ساتھ ہی معدُوم ہوکر رہجائیگی، اسی طرح جو لوگ اس دُنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، ان کے لئے بھی لازم ہے، کہ وُہ کچھ کام کریں!

اس بحث نے بھی کسی قدر طُول پکڑ لیا، الغرض اب ہم ناظرین سے پُوچھنا چاہتے ہیں، کہ آپ نے شاعر کے تخیل اور اُس کی وسعت کو ملاحظہ فرمایا؟ کہ وُہ کسطرح زندگی کے روزمرّہ تاثرات میں ایک ہی چیز سے کئی کئی نتائج پیدا کرتا، اور کس طرح انداز کی خوبی سے بیان میں ایک مقناطیسی کشش بھر دیتا ہے: پس اس کے بعد وُہ باقیماندہ مثالیں بھی نقل کر دی جاتی ہیں، جو تخیل کے زیرِ عنوان مرزا کے کلام سے ہمارے پاس موجود ہیں:-

محبوب کی نسبت کہتے ہیں :-

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

دوست کے گھر چلے گئے ہیں، اور اتفاق سے دیواروں کے روزن میں اُن بے تاب اور منتشر ذرّوں کو بھی دیکھ پایا ہے، جو آفتاب کی شعاؤں میں رقص کناں اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر آتے جاتے ہیں، پس تخیّل نے اس سے یہ دلیل پکڑی، کہ آفتاب بھی ان تمام خوبیوں اور تجمّل آرائیوں کے باوجود ہمارے محبوب کے حُسن کا دیوانہ ہے اور اسی لئے وہ اپنی شعاع نظر سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے، اسی انداز پر ایک اور شعر ہے:-

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

فرماتے ہیں، کہ حرماں نصیب باپ اگرچہ اپنے بیٹے یوسفؑ کی زنداں میں خبر نہ لے سکا، لیکن اُس کی آنکھیں اپنے لختِ جگر کے فراق میں روتے روتے نابینا ہو گئیں، اب اس خیال کو یوں ادا کیا ہے، کہ جو روزنِ دیوارِ زنداں میں دکھائی دیتے ہیں، وُہ گویا حقیقت میں یعقوبؑ کی وہی نابینا آنکھیں ہیں، جو اپنے بیٹے کی طرف نگراں ہیں، اور انہوں نے یہ صُورت اس لئے اختیار کی ہے، کہ اُس نازنین کا دم حبس سے گھٹنے نہ پائے، اور انہیں سُوراخوں سے وُہ باہر کا تماشا بھی دیکھ سکے، !

ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

یہ بھی حسنِ تخیل کی ایک بہترین مثال ہے، بیان کیا جاتا ہے، کہ جب زلیخا نے خفا ہو کر یوسف کو زنداں میں بھجوا دیا، تو ساتھ ہی داروغہ کو بھی حکم بھیجا کہ :-

معطر دار دیوار و درش را
منور ساز طاق و منظرش را (جامی)

اس فرمان کے مطابق اس محبس کی تزیین کی گئی، اب شاعر کی طبعِ رسا نے اس واقعہ سے یوں استدلال کیا، کہ یعقوبؑ کی آنکھوں سے جو سفیدی آنسوؤں کے ذریعہ سے بہ رہی ہے، اُسی سے قیدخانہ کی دیواریں روشن کی جا رہی ہیں، ..... جس کی شان یہ ہو، اس پر زلیخا کا اسطرح جان دینا اور زنانِ مصر کا فرطِ حیرت سے انگلیاں کاٹ بیٹھنا کچھ عجب نہیں !

پھر کہتے ہیں :-

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مرزا کو اس جدید جغرافیائی تحقیق کا کیا علم تھا، لیکن اسے تخیل کی دادرسی اور شاعر کی بلند نظری کہا چاہیئے، کہ اُس نے آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر اس مسئلہ کو یوں ادا کر دکھایا ہے، کہ آج بڑے بڑے فلسفی بھی اس خیال کو اس حسنِ انداز اور اس شانِ بلاغت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے، ..... کہتا ہے، کہ میرے احباب جو مجھے یہ طعنہ دیتے ہیں، کہ تیرے پیہم اور مسلسل گریہ نے اس گھر کو ویران کر دیا ہے، انہیں

معلوم نہیں، کہ اگر میں نہ بھی روتا، تو اس گھر نے اسی کا اسی طرح ویران ہی رہنا تھا، اس لئے کہ ازل ہی سے اس کی قسمت میں ویرانی کے سوا اور کچھ نہیں لکھا ہے، پھر اس کی دلیل یہ دی ہے، کہ جہاں اب سمندر ہے اگر یہ نہ بھی ہوتا، تو اس کی جگہ صحرا اور بیابان ہوتا، پس جب دونوں ویرانی میں ایک جیسے ہیں، تو شکائت کس بات کی؟

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

سائینس کی تحقیق ہے، کہ پانی بخارات بنکر ہوا میں اڑ جاتا ہے، چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے، کہ دیگچی کا ڈھکنا اٹھانے سے بخارات اوپر کو اٹھتے اور پھر آہستہ آہستہ نظر سے غائب بھی ہو جاتے ہیں، مرزا نے اپنے رنگ میں اس کی تصدیق یوں کی، کہ روتے روتے جب آنسو خشک ہو گئے، اور نالہ و فریاد کا آغاز ہوا تو فرمایا ع

"باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا"

ایک فلسفی بھی کیوں اسے تسلیم نہ کرے، کہ آنسوؤں کی گرمی نقاہت کی وجہ سے سرد ہوا میں منتقل ہو گئی ہے؟

پھر فرماتے ہیں:-

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

کون نہیں جانتا، کہ آگ سے پانی ڈالتے وقت صدا اٹھا کرتی ہے، یہ روزمرہ دیکھنے کی باتیں ہیں، لیکن شاعر کے تخیل نے اس سے یہ نتیجہ

پیدا کیا، کہ انسان بھی دُکھ درد کی حالت میں اسی طرح نالہ و فریاد کرنے پر مجبور ہے، اور یہ فطرت کا ایسا قانون ہے، جس سے کوئی شے بھی آزادی کا دعویٰ نہیں کر سکتی!

اسی طرح ایک اور شعر ہے:

توفیق باندازۂ ہمت ہے، ازل سے — آنکھوں میں وُہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

یہ ایک اخلاقی اور عملی سبق ہے، فرماتے ہیں کہ دُنیا میں جس قدر کسی کا ظرف ہوتا ہے، اُسی قدر وُہ اکتسابِ ہنر بھی کر سکتا ہے، اور قدرت نے ہر انسان کو اُس کے حوصلے اور ارادے کے مطابق توفیق بخشی ہے؛ اب نہ وُہ اس سے زیادہ کر سکتا ہے، نہ کم، چنانچہ تم دیکھتے نہیں، کہ جس قطرہ نے موتی بننا گوارا نہیں کیا تھا، قدرت نے بھی اُسے انسانی آنکھ جیسی برگزیدہ اور متبرک جگہ عنایت کی ہے، جہاں سے کبھی تو وُہ حبِّ قومی میں بہتا ہے، کبھی ایک حسین کے رخسار پر ڈھلکتا ہے، جیسے پھُول پر شبنم کے قطرات؛ اور کبھی توفیقِ خداوندی سے اس میں یہ شان پیدا ہوتی ہے، کہ:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے — قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اور اسی طرح:-

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات — یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہُوا

— اب قطرے کے یہی مختلف مدارج ہیں، جو اس کے حوصلے کی وُسعت یا کمی کو ظاہر کرتے ہیں، اور زندگی کا قانون جب ہر حالت میں ترقی اور فوقیت ہی ہے، تو پھر ہمت بھی اس کی تحصیل میں کسی طرح کی سُستی

یا کوتاہی کا موقع کیوں پیدا ہونے دے :-

دمادم نقشہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرار زندگی نیست

اگر امروز تو تصویر دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

پس غور کیا جائے، تو نہیں خصائص کے پیشِ نظر غالبؔ نے بھی اپنے شعر میں ایک ایسے عقدے کو حل کر کے رکھ دیا ہے، جو انسانوں کے لئے ہمیشہ سے وجۂ انتشار چلا آتا تھا، اور وہ عقدہ مسئلۂ تقدیر کا ایک نہائت عمدہ اور تسلّی بخش حل ہے، اس موضوع پر غالبؔ کا شعر بجائے خود لاثانی ہے — انداز بیان کی ندرت اور رفعت تخیل پر آپ سے آپ داد دیتا ہے، لیکن اقبالؔ نے بھی اس کی نسبت کوئی کمی باقی نہیں رہنے دی کچھ اشعار آپ دیکھ چکے، باقی ذیل میں ملاحظہ فرمائیے :-

از ضیاں نقدِ خودی در باختند
نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمز باریکش بحرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است!

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا
سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا!

شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست
قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست!

تخیّل کی بحث نے یہاں خاتمہ پایا، اب ہم دوسرے عنوان کو لیتے ہیں ✤

موسیقی اور ترنّم موسیقی بھی شعر کا ایک نہائت ضروری جزو ہے، جتنے باکمال شاعر ہوئے ہیں، ان سب کے کلام میں موسیقی پائی جاتی ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں مغربی شعراء کے چند اقوال بھی بطور اقتباس پیش کر دیئے جائیں، جن سے معلوم ہوگا، کہ دنیا کے تمام شاعر اس کے تاثرات اور خوبیوں پر کس طرح ہم آواز اور متفق دکھائی دیتے ہیں :-

موسیقی فرشتوں کی زبان ہے، (لانگ فیلو)
موسیقی ٹوٹے ہوئے دل کی دوا ہے، (سر لے ہنٹ)
کوئی دل ایسا ہے جو موسیقی کو سُن کر
بہہ نہ نکلے، (بی ٹی)
آسمان کی وُہ چیز جو زمین پر ہے، (ایڈیسن)
موسیقی ہوا کی شاعری ہے، (رچمر)
اگر انسان کے کان ہوں، تو ہر چیز میں
موسیقی موجود ہے، (بائرن)
(مرزا نے بھی یہی کہا :-
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا)
تمام مصنوعی چیزوں کو اپنی اپنی جگہ نمائش کر لینے دو،
لیکن رُوح کی ترجمانی تو موسیقی کے علاوہ اور کسی
شے سے نہیں ہو سکتی! (شلر)
مدھم اور بے کیف صدائیں تو بے شک فراموش
کر دی جاتی ہیں، لیکن موسیقی کے لطیف تاثرات

ہمارے دماغ سے کبھی محو نہیں ہوتے، (شیلے)

مجھے مرتے وقت موسیقی سنا دو، اس سے
زیادہ مسّرت کی مجھے تلاش نہیں، (کیٹس)

شاعر کے اس مصرعہ کو میں کلمۂ ایمان
سمجھتا ہوں، کہ: "وہ جن کو خدا سے محبّت
نہیں ہوتی، اُن کو موسیقی سے محبت (ٹی مارلے)
نہیں ہوتی"

آپ شکسپیئر کی نظمیں پڑھیئے، تو ایسا معلوم ہوگا، کہ موسیقی بھی خود بخود پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں صرف تلفظ ہی پیانہ کا کام دیتا ہے، انگریزی میں تو خیر بحر اور قافیہ و ردیف وغیرہ کا التزام ضروری نہیں سمجھا جاتا، لیکن مشرقی شاعری میں یہ چیزیں موسیقی کے لئے خاص طور پر معین ثابت ہوتی ہیں، عروض میں بعض اوزان ایسے ہیں، کہ موسیقی اُن سے از خود پیدا ہوتی ہے، فارسی میں قاآنی کی تمام شاعری ایسے ہی نغموں سے معمور ہے، ہر شعر میں سُر اور تال ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اُردو میں بھی مومن اور داغ کے ہاں بعض بعض جگہ یہ جھلک دکھائی دیتی ہے، اور غالب کا تو کلام ہی سراپا موسیقی ہے، مرزا نے بحریں ایسی اختیار کی ہیں، جو بجائے خود ترنم ریز ہیں، اور پھر قافیہ و ردیف کا انتخاب اس کے علاوہ ہے، یہاں مثال کے طور پر دو ایک غزلیں پیش کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو:-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں | خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں | لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں | شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر | لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے | ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق | میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام | قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں | تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا | بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار | جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں
بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے | میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب | یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں
جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا | سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم | ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج | مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اس غزل کا ہر شعر اس قدر مترنم ہے، کہ ہر بار طبیعت میں ایک وجد سا پیدا ہونے لگتا ہے، اور پھر مرزا نے قافیے ایسے اچھے اختیار کئے ہیں

کہ ان کی نظیر نہیں، آج کوئی ایک شعر بھی ایسا کہہ کر تو دکھائے!

یہاں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ جب کسی شاعر کو کوئی اچھا اور دلپسند قافیہ دستیاب بھی ہو جائے تو ہمیشہ اسکو تخیّل کے زیر اثر رکھنا چاہیئے۔ ورنہ اگر اس کا خلاف کیا گیا، یعنی تخیّل کو قافیئے کا محکوم بنا دیا گیا، تو نہ صرف شعر میں ایک آورد کا سا رنگ پیدا ہو جائیگا، بلکہ لازمی طور پر وہ موسیقی اور ترنم سے بھی عاری رہیگا!

اس کے علاوہ کیوں شاعر ہی ایسا برق مثال اور سریع الطبع نہ ہو، کہ قافیہ اس سے بلا دقّت خود بخود بندھ جائے؟ اور کیوں وہ اس کیلئے کسی اچھے خیال کی تلاش کرتا پھرے؟ کیا اس سے فن کا عجز اور شاعر کا افلاس ثابت نہیں ہوتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ایک گھوڑا کتنا ہی شوخ اور سرکش کیوں نہ ہو، لیکن جب اُس کا سوار اپنے بازوؤں میں کافی سے زیادہ قوّت رکھتا ہو، تو اُس کی مجال نہیں، کہ وہ اپنا صحیح راستہ چھوڑ کر کسی اور راستہ پر ہولے، وہ نتیجہ کار اس کو مسخر کر ہی کے چھوڑیگا!

مرزا نے اپنے کلام میں جگہ جگہ ایسا ہی بے ساختہ پن دکھایا ہے، چنانچہ اس معیار پر ایک اور غزل ہے:-

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے	کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل	اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے	کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر	کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا	ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے | پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے | تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے | کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اسی طرح ایک اور غزل کے چند اشعار ہیں:

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی | دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق | تکلیف پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی
دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا | موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی | اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا | مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

— دیکھی آپ نے قافیوں کی پیچیدگی؟ اور دیکھی آپ نے تخیل کی بلند پروازی؟ صوری اور معنوی محاسن کا تسلسل اسی طور پر قائم رہتا ہے، کہ ہر ہر لفظ کے ساتھ موسیقی نشے کی طرح دل و دماغ پر چھا جائے، اور خواب رنگین کی شکل رُوح کی تمام کلفتوں کو زائل کر دے، کیا شعر اس کے بغیر بھی تکمیل کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے، ..... مانا کہ ایک مغنی ساز کی مدد سے شعر میں موسیقی پیدا کر دے گا، لیکن غور کیا جائے تو اس کا یہ فعل ایک خارجی حیثیت رکھتا ہے، جب تک شعر ہی بجائے خود اپنے اندر وہ تمام کیفیات اور وہ تمام خواص مضمر نہ رکھتا ہو، جو ساز کے

ایک ایک تار میں پوشیدہ ہیں، تو پھر ایسا شعر کہنے سے فائدہ ہی کیا؟
اور پھر ایسے شعر کو ہم شعر کا خطاب کس لئے دیں؟'
اس جگہ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیئے، کہ شعر بجائے خود کتنا ہی ترنّم ریز کیوں نہ ہو، لیکن اسمیں جو چیز سب سے زیادہ موسیقی کا عنصر پیدا کر دیتی ہے، وُہ فی الحقیقت انسان کا ذاتی وجدان ہے، قدرت نے ہمارے کانوں کی تشکیل اور بناوٹ ہی میں ایک ساز کے سے خواص جمع کر دیئے ہیں، لہذا جو آواز بھی کسی کے ہونٹوں سے اُٹھتی ہے، قوتِ سامعہ اس کو بالکل اسی صُورت اور اسی ہیئت میں قبول نہیں کر لیتی، بلکہ ہوا کی لہریں اس آواز کو لئے ہوئے جب ہمارے کان تک پہنچتی ہیں، تو کان کے پردے اس کو بلاتخت قبول کرنے کی بجائے پہلے منتشر کر لیتے ہیں، پھر اُن میں سے ہر پردہ اپنی اپنی جگہ ایک جداگانہ کیفیّت کا حامل ہے، جو دُوسرے میں نہیں پائی جاتی، اور اس طرح سے وُہ آواز موسیقی کا بیشتر حصّہ انہیں ذرائع سے حاصل کرتی ہوئی ایک نازک اور لطیف پردے سے جا کر ٹکراتی ہے، اور ہمیں سنائی دیتا ہے، لیکن ہنوز یہ آواز بھی ہمارے لئے مہمل اور بے معنی تھی، پھر جس نے ہمیں اس کا مفہوم سمجھایا، وُہ ہماری قوّتِ مدرکہ ہے، جس کا احساس دماغی اعصاب کرتے ہیں، جہاں تک میں نے غور کیا، موسیقی کو اخذ کرنے میں تمام انسانوں کی قوّت مدرکہ یکساں ہوتی ہے، ہاں اس سے متاثر ہونے اور اس وجدان کی تکمیل کے لئے جس کا ذکر میں نے ابتداء میں کیا، "قوّت حاسہ" ایک نہایت ضروری چیز ہے، اس کا

تعلق انسانی دل سے ہے، اور سب میں یکساں طور پر نہیں پائی جاتی، یہ قوت جس شخص میں جتنی زیادہ پائی جائے گی، اُسی قدر وُہ موسیقی کے والہانہ لطائف سے زیادہ محظوظ ہوسکیگا، اور سچ پوچھو تو ہمارے پاس یہی ایک ایسا معیار ہے جس کی رُو سے ہم ایک شاعر اور غیر شاعر میں امتیاز کرتے ہیں!

موسیقی کے انہیں تاثرات پر یہاں ایک بات نقل کرتا ہوں، جو مناسب مقام ہونے کے علاوہ کسی طرح بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی، پچھلے دنوں ایک دوست نے مجھ سے بیان کیا، کہ ایک دفعہ بمبئی میں کسی امیرزادے کے ہاں ٹھیرنے کا اتفاق ہُوا، خوش گلو ہونے کے علاوہ دولتِ حُسن سے بھی مالا مال تھا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی، پھر ستار ہاتھ میں لی، اور میری پیٹھ ٹھونک کر پُورے ادّعا سے کہنے لگا: "لیجیے مولانا! ایک طرف میرا گانا سنیئے، اور دُوسری طرف بارش کا نزول دیکھئے" میں نے اُوپر کو نظر اُٹھائی، تو مطلع بالکل صاف تھا، لہٰذا اس انوکھی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، اور ان سے کہا "میاں ہوش میں آؤ، مطلع بالکل صاف ہے، ستارے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، بھلا بارش کیونکر ہوسکتی ہے" ـــــ "اچھا تو پھر دیکھتے رہیئے گا!" اتنا کہا اور ستار چھیڑ دی: رات کی خنکی، موسم کی شگفتگی، اور پھر راگ کی مستی، نغمہ و سرود کا ایک بے پناہ تموّج؛ واللہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، کہ بادل کے ٹکڑے چاروں طرف سے گھر گھر کر ہمارے سروں پہ

چھا گئے، اور پھر اسی دوران میں بارش بھی ہونے لگی، اور اس قدر ہوئی، کہ گلی کوچے بہہ نکلے، ساری زندگی میں اتنا حیرت انگیز اور مبہوت بنا دینے والا واقعہ میں نے آج تک نہیں دیکھا، میں نے کہا "دوست! افق پہ کہیں آثار دیکھ کر یہ "پیشین گوئی" کر دی ہوگی آج کل جھولے اور شعبدہ بازیپروں کی داستانیں تو بہت سننے میں آتی ہیں، کہیں نقالی یا دل لگی کا شوق تو نہیں چرایا؟" — "نہیں! ہرگز نہیں!! یہ سب موسیقی کے اثرات ہیں" ایک تیز و تند اور غیر تمدنانہ جواب تھا،

میں نے یہ سنکر کہا کہ بھئی، تمہیں اس واقعہ پر تعجب ہے، میں جب رقّت کے عالم میں غالبؔ کی مخصوص غزلوں پر نغمہ سرائی کرتا ہوں تو آسمان سے "باران نور" برستی ہوئی دکھائی دیتی ہے، فرشتے اپنے سفید بازو پھیلائے چاروں طرف سے احاطہ کر لیتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح القدس کا نزول ہوا ہے، اور عالم کا ذرّہ ذرّہ اس موسیقی سے مدہوش ہوکر وجد کرنے لگتا ہے، تمہیں اس بارے میں "علم الیقین" بھی حاصل نہیں، اور مجھے خدا کے فضل سے "حق الیقین" حاصل ہے!

پھر میں نے اس خاص واقعہ کی تعبیر کرتے ہوئے انہیں تلایا، کہ نفسیاتی اصولوں کی بنا پر بھی برسات اور موسیقی میں ایک گہری مناسبت ہے، اور قوت حاسہ کی تیزی یہاں بھی اپنا اعجاز دکھاتی ہے، چنانچہ تم نے دیکھا ہوگا، کہ اب بھی ہندوستان میں اس موسم کے شروع ہوتے ہی نوخیز اور حسین لڑکیاں درختوں میں جھولے ڈال کر بعض گانے، جو اسی

حالت اور اسی موقع کے لئے مخصوص ہیں؛ گانا شروع کر دیتی ہیں، طبیعی حیثیت سے یہ چیز ان کے لئے گویا وقت کی انتہائی مسرت ہے ایک تو جوانی، دلوں میں ارتعاش پیدا کر دینے والے ولولے، آرزوؤں کی بھرمار، اس پر نغمے کی عطر بیزی؛ جذبات میں کیونکر ایک قیامت خیز ہیجان پیدا نہ ہوگا، اور پھر یہ ہیجان کیونکر اپنے جذب و کشش ہی سے با دلوں کے دل کے دل اکٹھے کر لینے پر قادر نہیں!! اس کے علاوہ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، قفنس کا بھی اپنی موسیقی کے سوز میں جل کر راکھ ہو جانا، اور پھر بارش ہی سے دوبارہ زندہ ہونا، اسی مناسبت کی بنا پر ہے، قدرت نے ان اجزاء کو معنوی طور پر کچھ اس طرح سے تحلیل کر دیا ہے، کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، اور ان کا یہ باطنی فعل ہی حقیقت میں بقائے عالم کا سرمایہ دار ہے؛ دوست کو میری یہ تعبیر بہت پسند آئی، اور تعریف میں مشغول ہو گئے،

تشبیہیں اور استعارات اُردو شاعری میں تو خاص طور پر یہ نقص چلا آتا ہے، کہ جو تشبیہیں یا استعارے متقدمین نے وضع کئے تھے بعد والوں نے انہیں پر اپنی بنائیں استوار کیں، اور کسی جدت کا پیدا کرنا گناہ سمجھا، چنانچہ بقول مولانا حالی معشوق کی صورت کو چاند سورج یا جنت سے، آنکھ کو نرگس یا دام یا بیمار سے، ابرو کو کمان یا محراب سے مژہ کو تیر سے، لبوں کو نبات یا آبحیات سے، منہ کو غنچہ سے، کمر کو بال سے اور دونوں کو عدم سے مشابہ قرار دینا مخصوص اور لازم ہو گیا، لیکن، ہم

دیکھتے ہیں، کہ مرزا کا دامن اس عیب سے بھی پاک ہے، وہ اس بارے میں لکیر کے فقیر نہیں ہیں، بلکہ دیگر صفات کی طرح یہاں بھی وہ ایک مجدد اور مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں، مبتذل تشبیہوں اور بیہودہ مناسبات سے غالب کو قدرتی طور پر نفرت تھی، اس نے دوسروں کی تقلید کو اپنے معیارِ فن کیلئے ایک بدترین عیب تصور کیا، اس کا عقیدہ تھا، کہ اوروں کی دی ہوئی چیز ہی پر قناعت کر لینا انسانی شرف کو مٹانا اور فطرت کے حقیقی کمالات کو غارت کرنا ہے، یہی وجہ ہے، کہ قدرت نے اسے ایک ایسی تخلیقی قوت عطا کی، جو آج تک کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی، ہم یہاں مثالیں دیکر اس حقیقت کا ثبوت پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو، چکنی ڈلی کے لئے کیسی کیسی عمدہ اور نادر مناسبات پیش کی ہیں :-

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیمان کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

حجر الاسود دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو سمجھ لیجئے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے　　کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہئے
کیوں اسے نکتۂ پیرایہن لیلا لکھئے　　کیوں اسے نقش پئے ناقۂ سلما کہئے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیئے

پھر فرماتے ہیں :-

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس شعر میں موج کو دام اور مگر کے منہ کو، جو دریاؤں میں اس کثرت سے ہوتے ہیں، اُس دام کے حلقوں سے تشبیہ دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی اپنی طرز کی ایک بالکل نادر اور اچھوتی تشبیہ ہے، اسی طرح :

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق　　میں یہ سمجھونگا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

یہاں آنکھ سے جو خون بہتا ہے، اُسے ایک روشن شمع سے تعبیر کیا گیا ہے، اس میں وجہ شبہ دونوں کی طبعی حرارت اور رنگ کی سُرخی ہے،

پھر کہتے ہیں :-

پس از مُردن بھی دیوانہ زیارتگاہِ طفلاں ہے　　شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

اس جگہ چنگاریوں کو پھولوں سے تشبیہ دی گئی ہے، اسی طرح دُوسری جگہ اپنے زخموں اور خون کے دھبوں کو پھولوں سے :-

وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق　　مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

گویا :-

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا　　اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

اس کے بعد :-

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو   دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

ایک دل کو دُوسرے دل کے ساتھ ملانے سے جو صورت پیدا ہوتی ہے اُسے یہاں اُن ہونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو افسوس کی حالت میں کھلے کے کھلے رہ گئے ہوں، مقصد یہ کہ :-

دہر میں نقشِ وفا وجۂ تسلی نہ ہُوا   ہے یہ وُہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا

پھر :-

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم   میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اس شعر میں محبوب کو آفتاب اور خود کو شبنم قرار دیا ہے، پہلی تشبیہ میں وجۂ شبہ حسن و خوبی کا اظہار ہے، اور دُوسری میں اپنی کمزوری اور ناتوانی کو ثابت کیا ہے، کہ آفتاب کے پرتو سے شبنم خود بخود کافور ہونے لگتی ہے،

پھر فرماتے ہیں :-

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع   چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

اس شعر میں تارِ شعاع کو جادۂ رہ سے تشبیہ دی ہے، اور پھر ماہِ نو کو اُس آغوشِ وداع سے تعبیر کیا ہے، جو دن کے سفیر یعنی سُورج کو رخصت کرنے کے لئے آسمان کی طرف سے وا کر دی گئی ہو،

پھر فرماتے ہیں :-

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کُھلنا   روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

یعنی میں دوست کے فراق میں اُسی طرح سے رو رو کر فنا ہو جاؤں گا جس طرح بہار کے موسم میں بادل برستا ہے، اور اس قدر برستا ہے، کہ نتیجہ کار اس کا نام نشان باقی نہیں رہتا، ظاہر ہے، کہ یہ بھی ایک نہائت عمدہ اور نادر تشبیہ ہے،

پھر فرماتے ہیں :-

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

مقصد اس شعر سے دُنیا کی بے ثباتی کو ظاہر کرنا ہے، یہاں کی ہر چیز فانی ہے، پھر مثال یُوں دی کہ آفتاب، جو تمام دُنیا کو روشنی پہنچاتا ہے، وُہ بھی اس چراغ کی حیثیت رکھتا ہے، جو ہوا کے رہگذر پر رکھا ہو، ظاہر ہے، کہ وُہ نتیجہ کار ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بُجھ جائیگا، اسی طرح آفتاب بھی دو گھڑی کا مہمان ہوتا ہے، پھر ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

رنگِ تمکینِ گُل و لالہ پریشاں کیوں ہے　　گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں

مضمون وُہی ہے، لیکن یہاں صرف تشبیہات کو بدل دیا گیا ہے یعنی گل و لالہ اور چراغان میں رنگ کی مماثلت اور عمر کے ہیچ ہونے میں جو مناسبت ہے، اُسے ظاہر کیا ہے، ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی　　دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دُنیا کا

اس جگہ "بہار" کو حنائے پائے خزاں سے مماثل بیان کیا ہے، بہار جب آتی ہے، تو اپنے ساتھ چمن میں اک عجیب رنگینی لاتی ہے، اسیطرح مہندی کا رنگ بھی بہار کا ایک جلوہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے، تو

کہتے ہیں، کہ جس طرح حنا کا رنگ دیکھتے ہی دیکھتے اُڑ جایا کرتا ہے، اسی طرح بہار کو بھی ثبات نہیں، کہ اس کے گذرتے ہی پھر خزاں کا دور آجاتا ہے، یہاں وجہ شبہ بے ثباتی اور رنگ ہیئت کی باہمی مماثلت ہے!

پھر :-

یاد کردہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

یہاں محبوب کی زلفوں کو دام سے، اور اُن میں جو کُنڈل ہوتے ہیں، اُنہیں اس دام کے حلقوں سے تشبیہ دی گئی ہے، پھر کہتا ہے، تجھے یاد نہیں، جب کہ اس دام کا ہر حلقہ عشاق کے دل چھیننے کے لئے ایک دیدۂ بیخواب کی مثل ہر وقت کشادہ رہتا تھا، پھر آج تجھے اپنے اسیروں کی پروا کیوں نہیں، اسی مفہوم کو دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے :-

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل ہر تارِ زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

یہاں تشبیہ میں ایک اور جدت پیدا کی، اور حلقوں کو چشمہائے کشادہ سے تعبیر کرتے ہوئے زلف کے ہر بال کو ان آنکھوں کی نظر قرار دیا؛ وہ نظر جو سُرمے کی وجہ سے اپنے اندر زہریلے تیر کا سا اثر رکھتی ہے،

پھر کہتے ہیں :-

نشّہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

محفل خوب گرم ہو رہی ہے، دور چل رہا ہے، نشہ دل و دماغ میں اک عجیب شادابی پیدا کرتا ہے، آلاتِ موسیقی میں سے جو چیز ہیں

موجود ہیں، وہ بھی گویا خوشی کے عالم میں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، حتیٰ کہ شراب کے شیشے بھی اپنی جگہ سے اُچھل اُچھل پڑتے ہیں :-

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

— شاعر اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے حسن تشبیہ سے سبزۂ و بہار کا تماشا بھی دکھاتا ہے، اور کہتا ہے، کہ نغمہ ہوا کی لہروں میں ایک حسین ندی کی شکل بہتا ہے، اور شراب کی جو صراحیاں رکھی ہیں، یہ گویا سرو ہیں، جو ہرے رنگ کا لباس پہنے ندی کے کنارے اس کی زینت کو دوبالا کر رہے ہوں،

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

"خندۂ دنداں نما" نکوہش یعنی ملامت کے لئے بھی ہوا کرتا ہے، بیان کرنا یہ مقصود ہے، کہ میں جو آرام سے وطن میں بیٹھا ہوں، تو ہر روز جب بھی صبح کی سفیدی نمودار ہوتی ہے، تو وہ گویا ایک خندۂ دنداں نما سے مجھے ملامت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، کہ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کس لئے بیٹھا ہے، باہر نکل اور دُنیا کے کسی کام کاج میں مصروف ہو، اسی انداز پر ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

یہاں دوستوں کا ہنسنا بھی ملامت ہی کے لئے ہے، کہتا ہے، کہ دوستوں کے ہنسنے سے جنونِ عشق کے جو انداز تھے، اُن میں کسی قدر

کمی آگئی ہے، یعنی اب میں اپنے جیب و دامن کو چاک نہیں کرتا، انسان جب ہنستا ہے، تو دانت صاف دکھائی دیتے ہیں، انہیں کو یہاں بخیئے سے تشبیہ دی ہے، کہ اس میں بھی ٹانکے دانتوں ہی کی طرح ایک دُوسرے کے بعد اُبھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں!

دانتوں ہی پر ایک اور نادر تشبیہ یاد آئی، لہذا اسے بھی دیکھتے چلیئے :-

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے　　سبحۂ زاہد ہُوا ہے خندہ زیرلب مجھے

اس شعر کا مطلب یہ ہے، کہ میں فارغ البالی اور عیش وسُرُور کی کی حالت میں بھی اپنے پروردگار کو نہیں بھُولا ہُوں، لیکن خوبی یہ کہ خندہ زیرلب کو سبحۂ زاہد سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی ہنسی ہی سے ذکرِ الٰہی کو بھی ثابت کر دیا، جو ایک طور پر محبّت اور شکرگزاری کی دلیل ہے،

حقیقی زاہد ریاکاری سے ڈرتے ہوئے اپنی تسبیح کبھی کسی کو نہیں دکھلایا کرتے، اور اسے دامن ہی کے نیچے چھپائے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں، اس لحاظ سے تشبیہ کی اس انتہائی مماثلت پر غور فرمائیے، کہ شاعر نے کس احتیاط سے اس کو "خندہ زیرلب" جیسی نازک اور لطیف ترکیب سے یاد کیا ہے،

اگر اسی جگہ خندۂ زیرلب کی جگہ خندۂ دنداں نما کو استعمال میں لایا جاتا، تو تشبیہ ناقص ہی نہیں، بلکہ سراسر باطل تھی!

پھر کہتا ہے :-

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے　　آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اس شعر میں اپنے دل کو آبگینے سے اور گرمیٔ خیال کو تندیٔ صہبا سے تعبیر کیا ہے، مطلب یہ کہ اگر فکر میں تیزی کا یہی عالم رہا تو میرا کمزور اور نحیف دل اس کی تاب نہیں لا سکیگا،

پھر کہتا ہے :-

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے　　دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

یہاں دریا کو زمین کے عرقِ انفعال سے یاد کیا گیا ہے، وہ مرزا کی وسعتِ جنوں کے لئے ناکافی ثابت ہوئی اس لئے شرمندگی سے پانی پانی ہو گئی ہے،

پھر فرماتے ہیں :-

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں　　ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

یہاں سوئی کے ناکے کو آنکھ سے، اور تاگے کو ان مسلسل آنسوؤں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو اس آنکھ سے بہتے ہوں، وجہ آنسو بہنے کی یہ ہے، کہ زخم بہت زیادہ خراب ہو چکے ہیں، اور سینے کے قابل نہیں رہے، اس لئے سوئی بھی حسرت اور یاس کے عالم میں رو تی ہے،!

پھر کہتے ہیں :-

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے　　کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

اس شعر میں ساغر کو متاعِ دستگرداں سے تشبیہ دی ہے،

متاعِ دستِ گرداں وہ ہے، جو ایک ہاتھ دی جائے، اور دوسرے ہاتھ لی جائے؛ ساقی بھی اس وقت تک ساغر نہیں دیتا، جبتک دل و دیں بیک وقت اُس کے حوالے نہ کر دیئے جائیں،

پھر فرماتے ہیں، :-

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو صبح بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

یہاں "صبح بہار" کو "پنبۂ مینا" سے تشبیہ دی ہے، وجۂ شبہ رنگ کی سفیدی اور معنی کی لطافت ہے، اس لئے کہ مینا بجائے خود منجملہ ان اسباب کے ہے، جو عیش و تنعّم کی حالت میں استعمال کئے جاتے ہیں، پھر بہار کا تماشا اس کے علاوہ ہے، اسی انداز پر ایک اور شعر ہے :-

بجلی ہے گرنہ سُنے نالہ ہائے بلبلِ زار کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

یہاں پھول کو کان سے اور شبنم کے روشن قطرات کو رُوئی سے مشابہ قرار دیا ہے، اور کہتے ہیں، کہ پھول جو بلبل کی آہ و پکار کو نہیں سنتا، تو اس کی وجہ یہ ہے، کہ اُس نے اپنے کان میں روئی ٹھونس رکھی ہے،

پھر فرماتے ہیں :-

قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

محبوب کے لبِ مرجاں کو دیکھ کر شراب کے قطرے اس حد تک متحیّر ہوئے، کہ یکے بعد دیگرے منجمد ہو ہو کر موتیوں کی صُورت اختیار

کرتے چلے گئے، حتیٰ کہ جام کے اندر جو خط تھا، وہ بھی جواہرات کی ایک نایاب لڑی بن گیا، اسی مفہوم کے پیشِ نظر ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

گلچیں کی نظر ہر وقت پھولوں کی سرخی اور رنگینی ہی میں محو رہا کرتی ہے، اسی طرح خطِ پیالہ نے بھی جب اس شوخ کے ہونٹوں کو دیکھا، تو سراپا نگاہِ گلچیں بن گیا!

پھر فرماتے ہیں :-

اسدؔ اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

یہاں بھی صرف تشبیہ ہی میں ندرت پیدا نہیں کی، بلکہ شعریت اور تغزّل کو بھی اس شان سے نمایاں کیا ہے، کہ پڑھتے ہی طبیعت پر کیف طاری ہو جاتا ہے،

پھر جب آفتاب کی حسنِ تشبیہ میں گوہر افشانی فرماتے ہیں، تو کہتے ہیں :-

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اِک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

ستاروں کی نسبت کہتے ہیں :-

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو	موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھُلا	اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھُلا

بتکدے میں رات کو چراغاں کیا جاتا ہے، اور وُہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا ستارے بکثرت جگمگا رہے ہیں، مرزا نے اسی مناسبت سے ستاروں کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے،

مرزا کا ایک خاص کمال یہ ہے، کہ جہاں وُہ کسی مبتذل یا فرسُودہ تشبیہ کو استعمال میں لاتے بھی ہیں، تو اس پیرائے سے کہ اس میں بجائے بدمزگی کے ایک دلاویز جدّت پیدا ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر :-

قید میں ہے تیرے وحشی کو وُہی زلف کی یاد	ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

زلف کو زنجیر سے تشبیہ دینا ایک نہائت مبتذل اور پامال سا مضمُون ہے، لیکن یہاں جس خوبی کے ساتھ اسے چسپاں کیا گیا ہے، وُہ دیکھنے کی چیز ہے،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں	تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

آنکھ کو شعراء بیمار سے تشبیہ دیتے چلے آتے ہیں، لیکن مرزا نے حسن انداز سے اس میں بھی جدّت کا ایک خاص رنگ نمایاں کر دیا ہے، ایک اور شعر ہے :

عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا　　دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی

معشوق کے دہن کو معدوم تسلیم کیا جاتا ہے، شاعر کہتا ہے، کہ او بے وفا! تیری بے وفائی اور جفا کاری کے چرچے آج حسینوں کی زبان پر ہیں، وُہ ایک دُوسرے سے اس کا ذکر کرتے ہیں، اور اس طرح تیرے لئے رسوائی کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوگیا ہے، جس کی آخری کڑیاں عدم سے جا ملتی ہیں، ظاہر ہے، کہ یہاں بھی تشبیہ اگرچہ پامال ہی تھی، لیکن شاعر کی نغز گوئی سے معانی میں ایک نئی شان پیدا ہوگئی!

غالب کا دیوان ایسی اور اس سے بھی اچھی تشبیہات سے معمور دکھائی دیتا ہے، لیکن چونکہ اس بحث نے بھی قدرے طُول پکڑ لیا ہے، اس لئے ہم اشعار نقل کرنے کی بجائے اب صرف اشارات ہی سے کام لیتے ہیں:-

چنانچہ موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے، دانہ ہائے تسبیح کو صد دلِ عشاق سے، جوہر آئینہ کو طوطیٔ بسمل سے، ہر قطرۂ خونِ تن کو نگینِ نام معشوق سے، پارہ ہائے جگر کو لعل بیش بہا سے، ناخن کو ابروُ او ہلال سے، سُرمہ کو دُودِ شعلۂ آواز سے، نالہ کو گردش سیارہ کی صدا سے، حلقۂ گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، موئے شیشہ کو دیدۂ ساغر کی مژگاں سے، سایۂ شاخِ گل کو افعی سے، جامِ زمرد کو داغِ پلنگ سے، سپیدۂ صبح کو جوئے شیر سے، آئینہ کو ورطہ سے، موجِ شراب کو مژہ خواب ناک سے، وعلیٰ ہذا مماثل بیان کیا ہے،

اب تو آپ پر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا، کہ غالب تشبیہات و استعارات وغیرہ کے اختراع میں بھی بجائے خود ایک مجدّد اور خلّاق کی حیثیت رکھتا ہے، اور جب تک شاعر میں فی الواقع یہ جذبہ پیدا نہ ہو، وُہ حقیقی معنوں میں شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ ایسی حالت میں اسے ایک نقّال اور محض دُوسروں کا آلۂ کار تصوّر کیا جائے گا: جسطرح ایک پتلی ناچتی ہے، لیکن اُسے معلوم نہیں ہوتا، کہ میں کس کے ہاتھوں پر ناچ رہی ہُوں!

الفاظ اور ترکیبیں

الفاظ اور معانی کے باہمی ربط کو واضح کرنے کے لئے کتاب العمدہ میں باب فی اللفظ والمعنیٰ ایک خاص عنوان قائم کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"لفظ جسم ہے اور مضمون رُوح ہے، دونوں کا ربط باہم ایسا ہے جیسا رُوح اور جسم کا ارتباط، کہ وُہ کمزور ہو گا، تو یہ بھی کمزور ہو گی، پس اگر معنیٰ میں نقص نہ ہو اور الفاظ میں ہو، تو شعر میں عیب سمجھا جائیگا، جس طرح لنگڑے یا لُنجے میں رُوح موجود ہوتی ہے، لیکن بدن میں عیب ہوتا ہے، اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں، لیکن مضمون اچھا نہ ہو تب بھی شعر خراب ہو گا، اور مضمون کی خرابی، الفاظ پر بھی اثر کرے گی، اگر مضمون بالکل لغو ہو، اور الفاظ اچھے ہوں، تو الفاظ بھی بیکار ہوں گے جسطرح مُردہ کا جسم کہ یُوں دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے، لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں، اسی طرح مضمون گو اچھا ہو، لیکن الفاظ اگر بے

ہیں، تب بھی شعر بیکار ہوگا، کیونکہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں جاسکتی۔[1]

اس معیار پر بھی دیکھا جائے، تو مرزا کے الفاظ اور ترکیبیں لاثانی ہیں، بلکہ جو شعریت اور جدّت ان میں موجود ہے، متقدمین کسی اور کے ہاں اس کا ہلکا سا نقش بھی نہیں پایا جاتا، غالبؔ کو خود بھی اس پر ناز تھا، اور بالکل بجا طور پر فرمایا ہے :۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے ۔۔۔ جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

ہر ترکیب اور ہر لفظ میں ایک ایسی والہانہ موسیقی پائی جاتی ہے، کہ گویا ایک نغمہ زار ہے، جس سے ہر قسم کی آوازیں اٹھتی ہیں، کولمبس کی مثل ہر لفظ میں ایک نئی دُنیا کا پتہ چلتا ہے، اور دل میں ایک نیا سوز و ساز پیدا ہوتا ہے، ایک جوہری بھی اپنے قیمتی جواہرات کو اس خوبی سے منسلک نہیں کرتا، جس خوبی سے کہ مرزا اپنے الفاظ کو ترتیب دیتے ہیں، ذیل میں ایک ایسا انتخاب درج کر دیا جاتا ہے، آپ خود اندازہ فرمائیں :۔

دامِ شنیدن، خمارِ رسوم، آتش خاموش، جوہر اندیشہ، گلبانگ تسلّی، شبنمستان[2]، ویرانۂ مے، پہلوئے اندیشہ، غرقِ نمکدان،

---

[1] شعر العجم جلد چہارم ص ۶۹

[2] واضح ہو، کہ ریگستان اور گلستان وغیرہ کے قیاس پر شبنمستان بھی مرزا ہی کی طبع جدّت طراز کا نتیجہ ہے، کسی اور سے بن نہیں پڑا ۱۲ منہ

خانہ زادِ زلف، زنجیر رسوائی، جمع و خرچ دریا، نقش ذلگارِ طاقِ نسیاں، موجِ نگاہ، نبضِ خس، تشنۂ فریاد، میکدۂ بے خروش، خلوتِ ناموس، صید زدامِ جستہ، خودداریٔ ساحل، شہپر رنگ، موجۂ گل، آئینۂ بادِ بہاری، گذرگاہِ خیال، برگ ادراک، طالع خاشاک، آئینۂ انتظار، خسِ جوہر، لذتِ سنگ، گردشِ رنگ، افشردۂ انگور، شہر آرزو، صحرا دستگاہ، دریا آشنا، محشرِ خیال، مژگانِ سوزن، مژگانِ نیم کنگرِ استغنا، سلکِ عافیت، معاشِ جنوں، دامِ تمنّا، دریائے بیتابی، وادیٔ خیال، سیاستِ دربان، نسیہ و نقدِ دو عالم، حنائے پائے خزاں، طلسمِ پیچ و تاب، طعنۂ نایافت، جنّتِ نگاہ، فردوسِ گوش، کالبدِ دلوا، گلستانِ تسلّی، چشمِ صحرا، قلزم صرصر، جو بارِ نغمہ، موجۂ رفتار، شیرازۂ مژگاں برخوردار بستر، رنگ فروغ، دامانِ خیال، قلزمِ خوں، غبارِ وحشت، شرار جستہ، جیبِ خیال، دعوتِ مژگاں، نوبہارِ ناز وغیرہ وغیرہ،

ان مثالوں میں ہر جگہ صوری اور معنوی محاسن کو اس طور پر مربوط کر دیا گیا ہے، کہ کہیں ذرہ برابر بھی فرق یا اختلاف پیدا ہونے نہیں پایا!

بلاغت بلاغت کیا ہے؟ تقلیلِ الفاظ بلا اختلالِ معنیٰ، اس لحاظ سے مرزا کا کلام سرتا پا بلاغت ہے، ایک وسیع سے وسیع مضمون کو گنتی کے چند الفاظ میں انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے ہیں، اور اس اختصار میں بعض جگہ ایک نہائت لطیف حذف

بھی پیدا ہو جاتا ہے، جو خاص انہیں کا حصّہ ہے، کوئی دوسرا ایسا کہے بھی، تو معانی میں یہ حسن پیدا نہیں کر سکتا، مثلاً :-

جھنکا کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

دُوسرے مصرع کے شروع میں یہ چند الفاظ محذوف ہیں (اور آج جو خلافِ معمول آیا ہے تو) اس طرح سے پُورے کا پُورا شعر ایک دلاویز نثر کی صُورت اختیار کر لیتا ہے، لیکن اس میں بھی وُہ کیفیت نہیں، جسے انسان کا وجدان شعر کے پڑھنے سے خود بخود پا لیتا ہے، اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

بہرا ہُوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

دوست نے ایک بات کہی، اور مرزا نے دانستہ تجاہلِ عارف اختیار کیا، اور اس کا سبب یہ تھا، کہ محبُوب کی آواز میں جو حلاوت، جو موسیقی، اور جو دلربا شعریّت ہے، کان اس سے بار بار لذّت یاب ہوں :

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے جلّاد کو لیکن وُہ کہے جائیں کہ ہاں اور

اور اسی طرح :-

میں گیا بھی واں تو اُنکی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

یعنی دُعائیں تو جسقدر بھی مجھے یاد تھیں، درباں ہی کے بُرا بھلا کہنے پر اُس کی نذر کر چکا، اب جو لطافت اور رعنائیت آگے چل کر محبُوب کی "گالیوں" سے میرے دل کو حاصل ہونے والی ہے، اس کا

حق کہاں سے ادا کرونگا؟ مومن کہتا ہے، :-

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا

اب عشق کے ان تمام احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب معشوق نے اپنے سوالات کا مرزا کی طرف سے کوئی جواب نہ پایا، تو سخت برہم ہوا اور بگڑ کر بولا، "بہرے ہو؟ بات کیوں نہیں سنتے؟"

اس پر بیچارے مرزا نے بھی اک نیاز مندانہ لہجہ میں کہا :-

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

اب خیال فرمایئے، کہ اس میں کتنی باتیں محذوف ہیں، اور اس حذف نے شعر میں کس قدر شوخی اور بلاغت کا اضافہ کیا،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو!

جھگڑا یہ ہے، کہ مرزا اپنے معشوق کو بشر منوانا چاہتے ہیں، اور وہ اسے اپنی توہین خیال کرتے ہوئے تسلیم نہیں کرتا، اور کہتا ہے کہ میں تو سورج اور چاند سے کسی طرح کم نہیں، پھر مجھے بشر کا خطاب کسلیئے دیا جائے، مرزا ناچار اس دعویٰ پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں، اور اپنے حقیقی مدعا کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ تم بلاشبہ سورج اور چاند ہی سہی، مجھے اس سے مطلق انکار نہیں، مگر یہ تو بتلاؤ، کہ کیا وہ بھی تمہاری طرح ظالم اور احسان فراموش ہیں؟ اور اگر وہ ایسے نہیں تو پھر میرے ساتھ یہ سلوک کیونکر جائز سمجھ لیا گیا ہے،

یہاں بھی آپ خیال فرما سکتے ہیں، کہ باہمی گفت و شنید کے کتنے اجزاء ہیں، جنہیں اس شعر میں حذف کر دیا گیا تھا، اور یہ حذف بھی رنگینی اور بلاغت میں کس قدر معین ثابت ہوا ہے، گویا:۔

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وُہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

پھر ایک اور شعر ہے:۔

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو
وُہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

یہاں بھی مرزا اپنے ایک ہمدرد دوست کو بطورِ قاصد، معشوق کی طرف بھیج رہے ہیں، اور اس کے سامنے اپنی خراب حالی اور محرُومی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ معشوق کو متاثر کرنے میں اپنی طرف سے کسی طرح کی کمی باقی نہ رہنے دینا، اور التجا کرنا، کہ اگر اس تشویشناک حالت میں بھی تُو نے اس کی خبر نہ لی، اور اسے ازراہِ شفقت اپنے پاس بلا نہ لیا، تو وُہ تیرے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیگا، اور وُہ وقت دُور نہیں، جبکہ تو اُس کی موت کی خبر بھی اپنے کانوں سے سُن لے، اس کے جواب میں وُہ ہمدرد دوست مرزا کو پوری تسلی دلاتا ہے، اور کہتا ہے، کہ میں تو اپنی طرف سے پُوری کوشش کرونگا، لیکن بلانا یا نہ بلانا اُس کے اختیار میں ہے، جس کی نسبت میں ذاتی طور پر ذمہ داری لینے کیلئے تیار نہیں!

یہ شعر بھی مرزا نے اس خوبی سے ترتیب دیا ہے، کہ اس میں اپنی التجا اور گریہ وزاری کو سراسر حذف کرتے ہوئے صرف دوست

کا جواب نقل کر دیا ہے، جس سے طبیعت اصل حالات کا خود بخود اندازہ کر لیتی ہے!'

پھر اس ضمن میں غالبؔ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے، کہ وہ اپنے شعر میں قوتِ ایمائی سے بہت کام لیتے ہیں' اور غور کیا جائے، تو یہ چیز بھی بجائے خود بلاغت کا جزوِ اعظم ہے، اکثر جگہ ایک ایک لفظ اپنے اندر لطائفِ معنویہ کے سینکڑوں گنجینے لئے ہوئے ہے، چنانچہ ذیل کی مثالوں سے آپ کو اس حقیقت کا اندازہ بہت اچھی طرح سے ہو جائیگا، فرماتے ہیں:-

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اب دیکھئے، کہ اس کے الفاظ اپنے لئے کس قدر وضاحت اور تشریح کے خواہاں ہیں'

(۱) حالت یہ ہے، کہ ایک بلبل چمن اور آشیاں سے جُدا ہو کر گرفتار ہو گئی ہے'

(۲) اُس نے اپنی آنکھوں سے بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے' اور قفس میں متردد ہے، کہ نہ معلوم میرا آشیانہ بچا یا جل گیا'

(۳) ایک اور بلبل جو اس کی ہمصفیر اور ہمدم ہے، سامنے کے درخت پر آ کر بیٹھ گئی ہے' اور اسیرِ قفس بلبل نے اس سے

روداد چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے'
(۴) مگر چونکہ اس کا آشیانہ جل گیا ہے، بلبل ہمصفیر مفصل حال کہتے ہوئے پس وپیش کرتی ہے، کہ اس آفتِ اسیری میں آشیانے کے جلنے کی خبر کیا سناؤں'
(۵) بلبل نوگرفتار کے دل میں اگرچہ اس کا کھٹکا ہے، تاہم اسنے اپنے دل کو مطمئن کرلیا ہے، کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں، کیا میرے ہی آشیانے پر بجلی گری ہوگی' اس لئے وہ اپنے ہمصفیر سے روداد چمن پوچھتی ہے، اور وہ اس کے بیان کرنے میں لیت ولعل کرتی ہے'
ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس شعر پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا، کہ کس حسنِ ترتیب کے ساتھ اسکا ایک ایک لفظ ایک وسیع مضمون کو ادا کر رہا ہے' بلبل کی نوگرفتاری کی طرف محض ایک "قفس" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے، اس مفہوم کو کہ "اُسنے خود چمن میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور اپنے آشیانے کی نسبت متردد ہے" صرف "کل" کے لفظ سے ادا کیا ہے، اس خیال کو کہ "اس کا ہمصفیر سامنے کی کسی شاخ پر آبیٹھا ہے" اور وہ اس سے روداد چمن دریافت کرنا چاہتی ہے، لیکن وہ اس کی ہمدردی کے خیال سے اس کے کہنے سے ڈرتا ہے" اس مختصر فقرہ میں کہ "مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم" ظاہر کیا ہے؛ اب اس تمام بحث سے شاعر کا اصل مقصود یہ ہے، کہ میں ہمیشہ سے موردِ آفات چلا آتا ہوں، اور زندگی کا کوئی پہلو بھی کبھی محفوظ رہنے

نہیں پایا، لیکن اس مضمون کو استعارے کا رنگ دیکر اشاروں ہی اشاروں میں اس بلاغت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہزاروں تفصیلیں اس پر سے قربان کی جا سکتی ہیں، مومن نے بھی اس مفہوم کو ادا تو کیا، لیکن غالب کا شعر اس سے کہیں بلند ہے، کیونکہ وہاں بربادی کے اسباب مکمل طور پر پائے جاتے ہیں، اور یہاں ناقص طور پہ، مومن کا شعر یہ ہے، موازنہ آپ خود فرمالیں :-

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے :-

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب یہاں بھی شعر کو پڑھتے ہی سوال پیدا ہوتا ہے، کہ بہشت میں دوست کا گھر یاد آجانے پر رضواں سے الجھ پڑنا کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن غور کیجئے تو مرزا کی نغز گوئی نے یہاں بھی بلاغت کو ایک نئی شان سے پیش کیا ہے، فقط "لڑائی" کا لفظ ہی اس میں ایک ایسا لفظ ہے، جو شعر کے تمام معنوی لطائف کی طرف خود بخود اشارہ کر رہا ہے، لڑائی کے حقیقت میں دو اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ وہاں محبوب جیسی دلربائی اور کشش کسی اور میں نہیں پائی جاتی، چنانچہ بقول خود :-

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ہے حورانِ خلد میں تری صورت مگر ہے

دوسرے یہ کہ وہاں ایسی رونق اور چہل پہل موجود نہیں، جیسی کہ ہم محبوب کے کوچے میں دیکھتے ہیں :-

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

تو اس کے بعد مرزا کا اصل مقصد اور مدّعا یہ ہے، کہ دل لگی اور فرحت کی ان تمام ضروریات کے ناپید ہوتے ہوئے بھی رضوان (داروغہ جنّت) کا ہم سے کہنا، کہ یہیں رہو، اور ایسی برگزیدہ جگہ کو چھوڑ کے اور کہیں نہ جاؤ، کس حد تک صحیح اور معقول تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر وہ اس پر ہم سے اصرار کرے، تو ہم اُس کے ساتھ متفق کیونکر ہو جائیں؟ گویا:-

بیٹھا ہی جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

مجنوں سے کسی نے دریافت کیا تھا، کہ "لیلے سے تو بیشک سب سمجھے محبت ہے، لیکن یہ کیا بات ہے، کہ تو اس کی بستی میں سے گذرتے ہوئے دیواروں کو بھی بوسہ دیتا ہے؟" اس نے جواب میں کہا، کہ "ان اینٹوں میں بھی مجھے لیلے ہی کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اس لئے میں انہیں بوسہ دینے پر مجبور رہوں!"

اسی طرح مرزا کا ایک اور شعر ہے:-

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یُوں بوسہ کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں

یہاں بھی مرزا نے معشوق سے بوسہ طلب کیا، لیکن وہ بجائے بوسہ دینے کے "غنچۂ ناشگفتہ" ہی کو دکھلا کے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہے، یعنی ہمارا تو دہن ہی "معدوم" ہے آپ بوسہ کس چیز کا لینگے؟ مرزا بھی ایک رند ہیں، اس جواب کو ناکافی سمجھتے ہوئے کہتے ہیں،

کہ میں تمہارے دہن کے "معدوم" ہونے کا ثبوت یوں نہیں چاہتا، بلکہ میرے نزدیک آکر ہونٹوں سے ہونٹ ملاؤ، تو پتہ چلے کہ تمہارا مُنہ فی الواقع ابھی "وجود" میں نہیں آیا ہے، تو اس شعر میں بھی فقط غنچۂ ناشگفتہ ہی کی ترکیب ہے، جو اس کی تمام رنگینی اور معنویت پر از خود اشارہ کر رہی ہے،

اس کے علاوہ عام طور پر بھی دیکھا جائے، تو مرزا کا کلام بلاغت کی حدِ کمال تک پہنچا ہوا ہے، ایک ایسے مضمون کو جو دفتر کے دفتر سیاہ کر دینے پر بھی ناقص اور تشنہ رہ جاتا، مرزا ایک ہی شعر میں ادا کر جاتے ہیں، اور اس خوبی سے کہ اس سے بہتر پیرایہ تصوّر میں نہیں آسکتا مثلاً اسی شعر کو لیجیے :-

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یُوں

یہاں فلسفۂ عمل کے ایک نہائت ہی دقیق مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، فرماتے ہیں، کہ زندگی کا سوز و ساز اور جذبۂ ارتقاء کا نشو و نما ایک پیہم اور مسلسل جدّوجہد سے ہے، باطنی تحریک اور ذوقِ جستجو کے استقلال سے ہے، حیاتِ جاوداں کا راز اگر کوئی معلوم کرنا چاہے، تو وُہ ایک غیر منقطع تکمیل میں ہے، وصال سے فطرتِ انسانی کی تمام قوتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں، اس سفر میں منزل کا نام بھی نہیں لینا چاہیئے کیا تم دیکھتے نہیں، کہ ایک موج اسی وقت تک بے تاب و بیقرار رہتی ہے

جب تک کہ وہ ذوقِ سفر اور شوقِ نمود سے آشنا رہے ہے، لیکن جونہی اس نے ساحل کی طرف رُخ کیا، وہیں اسکی تمام امکانی قوتیں زائل ہو جاتی ہیں اور وُہ موت کے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو جاتی ہے، اقبالؔ نے بھی ٹھیک کہا ہے :-

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد زوصال   چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

اور اسی طرح ایک دُوسری جگہ بھی :-

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے   زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اب مضمون کی اہمیّت اور نزاکت کو بھی آپ ملاحظہ فرمائیں، اور پھر مرزاؔ کے شعر کو بھی دیکھیں کہ کس حسنِ انداز اور عمدہ تمثیل سے اس کا حق ادا ہوا ہے!

پھر اسی مثال کو اِس کے دُوسرے پہلو یعنی حسن و عشق کے باہمی تعلقات، اور نفسیاتی خواص کے ماتحت دیکھا جائے، تو پھر بھی یہ ایک لاثانی تخیّل ہے :-

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ

گر ترے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی موج کا مضطرب یا بالفاظِ دیگر زندہ رہنا، ساحل سے دُور رہنے ہی پر تو موقوف ہے، اسی طرح ایک عاشق کے لئے بھی زندگی کا سامان فقط ہجر و فراق کے اندر ہے، اور یہ ایک ایسی ضرورت ہے، جس کے بغیر فکر و نظر کی تمام شعریّت برباد ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے،

کہ ایک دُوسرے مقام پر بھی کہا :-

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

مومن کا خیال یہاں بھی ٹھیک ہے :-

بیخودی غش تھے محو تھی دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

آپ کو یاد رہنا چاہیئے کہ غالب نے مومن کے ایک خاص شعر کے عوض جو اپنا سارا دیوان دے دینے کی آرزو کی تھی، تو اس کی وجہ بھی احساسات کا یہی پاکیزہ اور لطیف ہیجان تھا، وُہ شعر یہ ہے :-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ شعر تصوّر پر کہا گیا ہے، اور جیسا کہ ظاہر ہے، تصوّر کا وجود بغیر ہجر و فراق کے ممکن ہی نہیں ہو سکتا، گوئٹے جس کے خیالات غالب سے اس قدر متفق دکھائی دیتے ہیں، اس مقام پر بھی مرزا کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"اے جوان! آرزو کا رنگ اپنے ہاتھ میں لے، معشوق کی تصویر شب کی تنہائی میں کھینچ؛ اور اس طرح تمام دن اس کی شعاعِ نظر کے ذریعہ اطمینان اور خوشی کا میٹھا میٹھا رس پیتا رہ؛ — اگرچہ محبت کے صحیح قوانین کوئی عاشق بھی نہیں جانتا ہے، لیکن محبوب کا دیدار حاصل نہ ہو سکنے کی صُورت میں دل کی مسرّت ہر لحظہ ترقی کرتی رہتی ہے، اور یہ پھول کبھی مرجھانے نہیں پاتا!

اے دوست! وقت اور جدائی کی غیر فانی طاقتیں ہمارے خون

کو بہت جلد منجمد نہیں ہونے دیتیں، اور ان کی روشنی اپنے اندر ستارونکی
سی بلندی اور جگمگاہٹ رکھتی ہے : اگرچہ میرے حواس ایسی حالت میں
غم ضرور محسوس کرتے ہیں، لیکن پھر بھی میرا سینہ روز بروز فراخ ہوتا چلا جاتا
ہے، اور میں اسے پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط اور زیادہ مطمئن پاتا ہوں،
— اے دوست خدا کی رحمتیں ہوں ایسے مبارک سینے پر!

فراق کی حالت میں مَیں اپنے معشوق کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، (اور اگر
تو غور کرے) تو یہی راز ہے، میرے خوش و خرم، اور اندوہ سے آزاد رہنے
کا؛ اور یہی ہے وہ جنّت جس کا مقابلہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی!

بن دیکھے، معشوق کا آرزو مند رہنا بظاہر کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو،
لیکن (تجھے کیا معلوم کہ) یہی چیز نتیجہ کار ایک معصوم اور سچّی فدائیت میں
منتقل ہو جاتی ہے، اور یہی ہے وُہ مقام جہاں شوق اپنی انتہائی
عزّت کو حاصل کر لیتا ہے!

اے دوست! بادل بھی اس سبک سیری اور برق رفتاری سے
آسمانی بلندیوں میں نہیں تیر سکتا، جس سہولت اور جس بے تکلّفی سے کہ میرا
دل ہجر و فراق کی حالت میں اُڑتا، اور پرواز کرتا ہے، — اور اسطرح
حسد یا رقابت کے جھگڑوں سے آزاد رہکر میں اکیلا ہی اُس سے محبّت
کرتا ہوں، اور اس میں کوئی بھی میرا شریک نہیں[1]!

---

[1] اس نظم کا عنوان ہی گوئٹے نے "ہجر کی مسرّت" قرار دیا ہے، ۱۲ منہ

اس کے علاوہ شلر گوئٹے کا ایک دوست اور ہمعصر شاعر بھی اسی کی تصدیق کرتا ہے، اور کہتا ہے :-

"اگر تو نے حسن کو جدائی کے مضطرب لمحات میں کبھی نہیں دیکھا ہے، تو تُو یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرسکتا، کہ تُو نے حسن کی صحیح شعریت کو کبھی سمجھا بھی ہے"

فلسفۂ ہجر کی اس بحث کو سمجھ لینے کے بعد بعض دیگر مثالوں پر بھی نظر دوڑائیے، چنانچہ :-

نفس از انجمن آرزو سے باہر کھینچ　　　اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

فرماتے ہیں، کہ اگر مقصد براری کے لئے سامان ابھی مہیا نہیں ہوا ہے، تو کم از کم اُمید کا رشتہ تو ہاتھ سے نہ دے، آرزو ایک ایسی چیز ہے، جس کا ہونا عمل کے لئے نہائت ضروری ہے، بلکہ جو شخص آرزو کا جذبہ اور تمنا کی آگ اپنے سینے میں مشتعل نہیں رکھتا، اُسے سمجھ لینا چاہیئے، کہ خدا کے سامنے بھی میں رُوسیاہ ہوں، اور دُنیا میں بھی میرا کچھ حصّہ نہیں، آرزو حقیقت میں ایمان کی بنیاد ہے !

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار !
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار　(اقبال)

پھر فرماتے ہیں کہ :-

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　　لطمۂ موج کم از سیلیِ اُستاد نہیں

مضمون کی وُسعت کو دیکھیئے، اور پھر الفاظ کی بلاغت پر بھی نظر

ہو، کہا یہ گیا ہے کہ سلیم الفطرت انسان کے لئے مصائب اور تکلیفیں بھی اپنے ساتھ عبرت اور نصیحت کے بہت سے مفید سبق لاتی ہیں، لیکن کم حوصلہ اور تنگ ظرف لوگ ایسے زرّین مواقع کو بھی محض شکوہ و شکایت میں ضائع کر دیتے ہیں، مرزا نے ایک اور جگہ بھی اس خیال کو ظاہر کیا ہے :-

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

حُسنِ استدلال شعر کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے، کہ جہاں شاعر کسی چیز کا دعوٰی کرے، وہاں اس کی تصدیق کے لئے دلیل بھی ویسی ہی قوی اور معقول ہونی چاہیئے، اکثر شعراء کے ہاں دیکھا گیا ہے، کہ وہ کسی شے کے متعلق دعوٰی تو انتہائی شدّ و مد کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن ان کی دلیل اس قدر پھسپھسی اور بے جان سی ہوتی ہے، کہ اس کا طبیعت پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا، ہم یہاں دکھلانا چاہتے ہیں، کہ غالب اپنے اندازِ بلاغت کے ساتھ ہی ساتھ حسنِ استدلال میں بھی کتنا لطیف اور مؤثر سلیقہ رکھتے ہیں، شعریّت اور تخیل کی انتہائی خوبیوں کو برقرار رکھنے کے باوجود دعوٰی اور دلیل میں بھی ان کے دونوں پلڑے یکساں طور پر بھاری رہتے ہیں، چنانچہ ذیل کی چند مثالوں سے اس حقیقت کا اندازہ کیجیے، فرماتے ہیں :-

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یہاں دُوسرا مصرع دعویٰ کے طور پر لائے ہیں، اور پہلے مصرع میں اس دعویٰ کی دلیل پیش کی ہے، اگر کسی شخص کے سامنے محض دُوسرا مصرع ہی پڑھ دیا جائے، اور پہلے کی نسبت اُسے علم نہ ہو، تو وہ اس کو سُنکر بے اختیار ہنس دیگا، اور اسے کہنے والے کی بدحواسی پر محمول کریگا لیکن اس کے سامنے جب پُورا شعر پڑھ کر سنایا جائے، تو وہ سنتے ہی اس کی صداقت اور واقعیت پر سو جان سے قربان ہونے لگیگا، اخلاقیات میں "وفاداری" کا بھی ایک خاص درجہ ہے، اور جس شخص میں یہ صفت پائی جائے، وُہ ہر لحاظ سے قابل احترام بھی ہے، لیکن مرزا کہتے ہیں، کہ محض وفاداری بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے، کہ اس وفاداری میں "استواری" کا رنگ بھی موجود ہو، ایسی وفاداری جو ثبات و استقلال سے عاری ہو، کسی حالت میں بھی مفید نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے، کہ شیخ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اگر کعبہ سے بے وفائی کرے، تو ہم اسے کافر سے بھی بدتر سمجھینگے، کیونکہ اس کا ایمان اس بارے میں اتنا ہی بودا اور کمزور ثابت ہوا:-

گلۂ جفائے وفا نما، جو حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اسی طرح ایک برہمن، گو کہ وُہ ہمارے نزدیک مشرک اور بے دین ہے، لیکن "وفاداری" اور یقین جیسی صفاتِ عالیہ کو برقرار رکھنے کی وجہ سے پکا مومن ہوا، اور جب ایسا ہے، تو بے شک اسے کعبہ میں دفن

ہونے کے لئے جگہ ملنی چاہیئے !!

اقبال نے "اسرارِ خودی" میں بھی اس پاکیزہ اور مقدس خیال کو ایک مکالمے کی صورت میں بیان کیا ہے، چنانچہ شیخ کی زبانی برہمن کو یہ تلقین کیگئی ہے کہ :-

من نگویم از بتاں بیزار شو | کافری شائستۂ زنّار شو
اے امانت دار تہذیبِ کہن | پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیاتِ ملت است | کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نۂ | در خورِ طوفِ حریمِ دل نۂ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور | تو ز آزر من ز ابراہیمؑ دور
قیس ما سودائیِ محمل نشد | در جنونِ عاشقی کامل نشد

مرد چوں شمعِ خودی اندر وجود
از خیالِ آسماں پیما چہ سود !

یہ تو سب کچھ مرزا ہی کے استدلال کی مزید تشریح کیلئے آپ کے سامنے پیش کیا گیا، اب دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو، کہتے ہیں :-

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہاں بھی پہلا مصرع دعویٰ کے طور پر لائے ہیں، اور دوسرے مصرع میں اس دعویٰ کی دلیل پیش کی ہے، لیکن یاد رہے، کہ جسطرح مرزا نے اس شعر میں :-

کی بہرِ قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

"زود پشیماں" کو "دیر پشیماں" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، اسی طرح مندرجہ بالا شعر میں بھی "اہلِ ہمّت" کو طنزاً "پست ہمّت" اور ناکارہ لوگوں کے لیئے استعمال میں لائے ہیں، بیان کرنا یہ مقصود ہے، کہ دُنیا کا اس طرح سے آباد اور معمور دکھائی دینا پست ہمّت لوگوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے، کیونکہ اگر وُہ ہوتے، تو اُن کی سُستی اور لاپرواہی سے دُنیا لازمی طور پر ویران ہو جاتی، یہاں کی رونق اور گرم بازاری تو حقیقت میں زندہ دِل اور محنتی لوگوں سے ہے، پھر اس کا ثبوت یُوں پیش کیا، کہ میخانہ میں بھی پیمانہ وسبو جو شراب سے لبریز دکھائی دیتے ہیں، جو ایک طور پر اس کی معموری اور سلامتی کی دلیل ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے، کہ وہاں رِندانِ بادہ آشام یعنی باہمّت اور صاحبِ ظرف لوگ موجود نہیں: اسیطرح سمجھ لو، کہ دُنیا بھی پست ہمّت لوگوں کے معدُوم ہونے سے (جو زندہ ہوں یا مُردہ، ہر حالت میں معدُوم ہی ہیں) آباد دکھائی دیتی ہے، کیونکہ نہ ان میں اتنا حوصلہ ہے، اور نہ وُہ اس کارزارِ ہستی میں جوانمردی کیساتھ ٹھہر سکتے ہیں، اس بیان کا اخلاقی فائدہ یہ ہُوا، کہ عمل انسان کے لیئے لازمۂ حیات ہے!

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات لذّتِ تسخیر قانونِ حیات
(اقبال)

پھر فرماتے ہیں:-

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

دل کے کھوئے جانے پر کسی عاشقِ زار کا نالہ و فریاد کرنا، بالکل قدرتی چیز ہے، لیکن مرزا کے نزدیک اُس کا یہ فعل صرف تعجّب خیز ہی نہیں، بلکہ ناممکن بھی ہے' ان کی دلیل یہ ہے، کہ جب دل ہی پر انسانی زندگی کا دارومدار ٹھیرا، اور وہی سینہ سے غائب ہوگیا، تو پھر زبان بھی، جو دوسرے اعضاء کی طرح دل کی محکوم تھی، حرکت سے کیوں باز نہ آجائے؟' جب محرک ہی باقی نہ رہا، تو تحریک و جستجو کا کیا مطلب؟' گویا:-

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ کشتہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

معشوق سے کہتے ہیں، کہ ہم نے تو شروع ہی سے یہ جان رکھا تھا، کہ جو وعدہ تو کر رہا ہے، وہ نہائت سست بنیاد اور غیر معتبر ثابت ہوگا، اور ہمارا اپنے اس خیال پر دلیل پکڑنا تیری نازک اندامی کی وجہ سے تھا، کہ تجھ جیسا لطیف و نظیف ایک مضبوط اور پختہ چیز کو کب توڑ سکتا ہے، یہ رشتہ ابتداء ہی سے بودا اور کمزور تھا، جبھی تو تو اسے توڑ بھی سکا ہے! گویا :-

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

پھر فرماتے ہیں، کہ :-

نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

یہاں پھر معانی میں ایک نئی بلندی اور نئی شان پیدا کر کے محبوب کی جفا کاری اور ظلم و ستم کا ثبوت پیش کیا ہے، فعل اپنے فاعل کی وسعت و قابلیت پر دلیل ہوا کرتا ہے، اسی طرح یہاں زخم جگر کی گہرائی بھی یہ ظاہر کر رہی ہے، کہ معشوق تنومند اور شہ زور ہونے کے علاوہ پرلے درجے کا بے رحم بھی ہے، لیکن بایں ہمہ شاعر کو اس کی خیر خواہی منظور ہے، اور دوستوں کو منع کرتا ہے، کہ وہ ان زخموں کو نہ دیکھیں کیونکہ ایسا کرنے سے معشوق کے دست و بازو کو نظر لگ جانے کا اندیشہ ہے،

اس کے علاوہ :-

عرض نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے　　دعوئِ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

دعوی تو یہ ہے، کہ دوستوں کا آپس میں مل بیٹھنا، اور محبت و وفاداری کے پیمان باندھنا بالکل بے بنیاد، اور سراسر مضحکہ خیز ہے، لیکن مزا یہ ہے کہ اس کی دلیل کے لئے مثال بھی ایسی لائے ہیں، جس میں جمعیت اور محفل آرائی کے ساتھ ہی ساتھ اسکے بطلان کے لئے ثبوت بھی خود بخود پایا جائے، یعنی دانت باوجود آپس میں متحد اور مربوط ہونے کے اس حالت پر از راہ تشنیع ہنس رہے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ یہ منظر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکیگا!

پھر فرماتے ہیں کہ :-

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

اس شعر میں بھی دعوٰی یہ ہے، کہ ہمارا گھر ہر زمانہ اور ہر حالت میں ویران ہی ویران دکھائی دیتا، اگر سیلِ گریہ اسے تباہ نہ کرتا، تو تم دیکھتے کہ گھاس پھونس کی فراوانی ہی سے اس نے ایک وحشتناک جنگل کی صورت اختیار کر لی ہے :

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

—— پھر اس کے لئے دلیل یہ پیش کی، کہ جس جگہ اب سمندر ہے، یہ اگر وہاں نہ بھی ہوتا، تو اس کی جگہ صحرا اور بیابان کا ہونا یقینی تھا، پس جب مقصود ہر حالت میں بربادی ہی ہے، تو وہ جنگل سے ہوئی تو کیا، اور دریا سے ہوئی تو کیا ؟"

پھر فرماتے ہیں کہ :۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اس شعر میں یہ فلسفہ بیان کیا گیا ہے، کہ دُنیا کی ہر چیز اپنی اپنی ضروریات اپنے اپنے عشق، اور اپنے اپنے ذوق و شوق کی کوئی نہ کوئی دلیل اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے، چنانچہ قمری کو دیکھو، کہ وہ سرو کی جدائی میں جل جل کر راکھ ہوگئی ہے، اسی طرح بلبل بھی اپنی دُم کے نیچے پھول کی مانند سرخ رنگ کا ایک داغ لئے ہوئے ہے، جو اُس کے عشق پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح شاعر کے جگرِ سوختہ کی دلیل بھی سوائے نالہ کے اور کونسی چیز ہوسکتی ہے، اقبالؔ نے بھی عشق کے اس معنوی تسلسل اور اشیا کے باہمی ربط و ضبط کو اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے :۔

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

اکبر الہ آبادی کے یہ چند اشعار بھی اسی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہوئے پائے گئے :-

شاہد بزم ازل نے اِک نگاہِ ناز سے
عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا

شورِ شیریں کا مزا رکھا سرِ فرہاد میں
قیس کو دیوانۂ اندازِ لیلےٰ کر دیا

گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع
رنگِ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

ذوقِ نظارہ سے جانوں کو ملایا خاک میں
گردشِ چشم بتاں سے حشر برپا کر دیا

گویا دنیا میں یہ سارا فیض اور تمام چہل پہل جو ہم دیکھتے ہیں، یہ سب عشق ہی کی برکت سے ہے، بالفرض اگر یہی ایک چیز وجود میں نہ آتی، تو دنیا کی پیدائش ہی باطل تھی، اور ایسی حالت میں وہ ایک ایسا جسم سمجھا جاتا، جو روح سے یکسر محروم ہو، غالب خود اس فلسفے کو ایک اور شعر میں بوجہ احسن بیان کر چکا ہے، اور وہ اس طرح کہ :-

رونق ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اور اقبالؔ تو اس کے سوز و اثر کو اس قدر وسیع تبلاتا ہے کہ:۔

بہ برگِ لالہ رنگ آمیزیٔ عشق . بجانِ ما بلا انگیزیٔ عشق
اگر ایں خاکداں را واشگافی درونش بنگری خونریزیٔ عشق

.... پس غالبؔ کے ہاں بھی عشق کے یہی تاثرات ہیں، جنھیں ہم قمری، بلبل اور شاعر کے جگر سوختہ کی دلیل بیان کر چکے ہیں، قدرت نے یہ بیش بہا نعمت ہر ذی حیات کو "بقدرِ ظرف" عنائت کی ہے، اور ہر جگہ اس کی تقسیم ایک مناسب نظام کے ماتحت عمل میں آئی ہے، میں اس مفہوم کو بھی اُن تشریحات سے منطبق کئے دیتا ہوں، جنکو "جاوید نامہ" میں غالبؔ ہی کی زبانی بطور استفسار نقل کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:۔

نالۂ کو خیزد از سوزِ جگر ہر کجا تاثیرِ او دیدم دگر!
قمری از تاثیرِ او وا سوختہ بلبل از وے رنگہا اندوختہ!
اندر و مرگے بآغوشِ حیات یک نفس اینجا حیات آنجا ممات!
آنچناں رنگے کہ ارژنگی ازوست آنچناں رنگے کہ بیرنگی ازوست
تو ندانی ایں مقام رنگ و بوست قسمتِ ہر دل بقدرِ ہائے و ہوست!

یا برنگ آیا بہ بیرنگی گذر
تا نشانے گیری از سوزِ جگر!

اس کے بعد ہمارے لئے ایک چیز خاص طور پر تحقیق کے قابل رہجاتی ہے، اور وُہ اس شعر کے لفظی مناسبات کا تسلی بخش حل ہے، لہذا

اسے ایک دفعہ پھر بنظرِ غور ملاحظہ فرمائیے :-

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

مدّت سے یہ شعر ادباء کے لئے ایک دلچسپ بحث چلا آتا ہے، اور ہر شخص نے بجائے خود دُوسرے شارحین سے اختلاف بھی کیا، رسائل میں پے در پے مضامین بھی شائع ہوئے، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے یہ کوئی نہ سمجھ سکا، کہ قمری کو تو راکھ کے ساتھ مشابہت ہے بھی، مگر بلبل کو قفس سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے، راقم الحروف عرض کرتا ہے، کہ یہاں قفس سے پنجرہ مراد نہیں ہے، بلکہ پھولوں کی وُہ ٹوکری ہے، جو بلبل کو قید کرنے کے لئے کبھی کبھی استعمال میں لائی جا سکتی ہے، جیسا کہ شاعر نے خود بھی کہا :-

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں مژدہ اے مُرغ کہ باغ میں صبا نہیں

اس کے علاوہ میرزا صائب کے ایک شعر سے بھی اسی مفہوم کی تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ :-

شکستہ بال و پرانیم جائے آں دارد کہ باغباں کُند از چوبِ گل قفس ما را

پھر دُوسرے مصرع میں "اے" بمعنی "جز" سمجھنا چاہیئے، یہ استفہام افزائشِ بلاغت کے لئے لایا گیا ہے، لطف یہ کہ شاعر جس چیز سے اپنے جگرِ سوختہ کا نشان دریافت کرنا چاہتا ہے، وُہی حقیقت میں اس کی علامت بھی ہے، جس شعر میں تعجب نہ پایا جائے وُہ شعر ہی نہیں، اور جیسا کہ ظاہر ہے، مرزا نے یہ انداز محض تعجب پیدا

کرنے کے لئے اختیار کیا ہے، شعر میں تجاہل عارف بھی معانی کے اسی
حُسن کو برقرار رکھنے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے، چنانچہ اسی انداز
کو لئے ہوئے مرزؔا کا ایک اور شعر ہے :۔

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خُدا
آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

کائناتِ عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز، قطع نظر اس سے کہ وُہ جاندار ہے
یا بے جان، خدا کے دیدار کی متلاشی ہے، لیکن مرزؔا جانتے بُوجھتے ہوئے
بھی خُدا ہی سے اس حقیقت کو دریافت بھی فرمانا چاہتے ہیں،

تو معلوم ہُوا، کہ اس طرزِ بیان سے شاعر کا مقصد، سامع کے دل
میں ہیجان پیدا کرنا، اور ایک بات کو زیادہ سے زیادہ رقیق، زیادہ سے زیادہ
لطیف، اور زیادہ سے زیادہ مؤثر شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے!

معنی آفرینی

معنی آفرینی بھی کلام غالبؔ کا ایک خاص جوہر ہے، ہم
جب بھی اشعار پر غور سے نظر کرتے ہیں، ہر دفعہ معانی کا ایک نیا جلوہ
سامنے آتا ہے، ہر بات سے ایک نہ ایک لطیف نکتہ ضرور پیدا ہوتا ہے
یہ بھی گویا ایک معدن ہے، کہ جس قدر کھودتے جاؤ، جواہرات بھی نیچے سے
برآمد ہونے چلے جاتے ہیں، چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں،
ملاحظہ ہو :۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اس شعر سے جہاں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں، کہ محبوب جب بھی چاہے،
بڑی خوشی سے ہمیں بلا سکتا ہے، اور ہم تعمیل ارشاد میں فی الفور حاضر

ہو جائینگے، وہاں ایک اور معنی بھی، جنہیں اصل میں ایک اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم سمجھنا چاہیئے، یہ پیدا ہوئے کہ گیا ہوا وقت دوبارہ ہاتھ نہیں آیا کرتا، لہٰذا اسے بیہودہ باتوں میں ضائع نہیں کر دینا چاہیئے: ایک خود مرزا کا آنا ہے، اور دوسرے وقت کا لوٹ کر آنا، لیکن خوبی یہ ہے، کہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں ادا کر دیا گیا ہے،

اسی انداز پر دوسرا شعر ہے:۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے، کہ اٹھا بھی سکوں

شاعر بسترِ علالت پر ہے، ضعف سے حرکت کرنے کی بھی تاب نہیں اور اغیار ہیں، کہ وہ بجائے عیادت کے الٹا زخم پر نیش زنی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ ایک تو بے نصیب ہجر کا مارا یہاں تڑپ رہا ہے، اور ایک ہم ہیں، کہ دوست کے ساتھ مزے سے بسر اوقات کرتے ہیں؛ یا زیادہ سے زیادہ لطف و کرم فرمایا، تو یوں گویا ہوئے:۔

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُسکے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک
مجھکو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنسکے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہاں تلک تو ایک بات ہوئی، لیکن دوسری حیثیت سے شاعر کو اپنے ضعف اور کمزوری کی شدت کا اظہار منظور ہے، اور کہتا ہے، کہ میں ان

تمام باتوں کو بڑی خوشی سے برداشت کرلونگا، اور کیسے نہ کروں جبکہ میں ضعف کی وجہ سے اس قابل بھی نہیں ہوں، کہ تکیے سے اپنا سر ہی اٹھا سکوں!

یہاں بھی ایک سر کا اُٹھانا ہے، اور ایک بات کا اٹھانا، یعنی اسے برداشت کرنا،

اسی طرح تیسرا شعر بھی ہے :-

زہر ملتا ہی نہیں مجکو ستمگر ورنہ　　کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یعنی میں تیرے جور و ستم سے اس درجہ تنگ آچکا ہوں، کہ مجھے اب زہر کی تلاش ہے، کہ اسے کھاؤں، اور ہمیشہ کے لئے سو رہوں، لیکن افسوس کہ وہ مجھے کہیں بھی میسّر نہیں آتا،.... پھر اسی ضمن میں ایک ایسی متضاد بات پیدا کی، جو فی الحقیقت ہر عاشق کا ایک فطری خاصّہ ہوا کرتا ہے، یعنی انتہائی خوبی سے اپنی محبّت اور شوق کا اظہار بھی کیا ہے، اور کہتا ہے کہ زہر کا کھالینا کوئی مشکل یا ناگوار کام نہیں، لیکن اگر کوئی مجھ سے یہ کہے، کہ تم سے ملنا اور محبّت کرنا چھوڑ دوں، تو یہ مجھ سے ہرگز ممکن نہیں ہوسکتا، گویا :-

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے　　تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اسی طرح :-

سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرّر چاہا　　ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہی ہمکو

یہ شعر بھی دو متضاد معنی رکھتا ہے، ایک تو یہ کہ "تیرے سر کی قسم ہم تجھے

ضرور قتل کریں گے" دُوسرے یہ کہ "ہمیں تیرے سر کی قسم ہے" یعنی ہم نے تیرا قتل کرنا اپنے نزدیک حرام قرار دے لیا ہؤا ہے، پہلی صورت میں بات کی تاکید اور عہد کا استحکام پایا جاتا ہے، اور دُوسری حیثیت میں محبوب کی شوخ مزاجی، اور ناز و ادا کی سرکشی ثابت ہوتی ہے: یہاں معنی محاورے اور مجاز کی رو سے ہوں گے!

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یہاں بھی شعر اگرچہ دو معنی رکھتا ہے، لیکن دونوں پہلو آپس میں متضاد واقع ہوئے ہیں، ایک معنی تو یہ ہوئے، کہ جب ہم نے دشت کی ویرانی کو دیکھا، تو خوف اور دہشت سے ہمیں گھر کی راحت اور خوشی کا احساس ہؤا، کہ بارِ خدایا! قسمت ہمیں کیسی سرزمین میں لے آئی ہے، کہ جہاں نہ انسان ہے، نہ انسان کی ذات، اور دُوسرے معنی یہ ہیں، کہ دشت کی اس ویرانی کو دیکھ کر گھر کا نقشہ یاد آگیا، کہ وُہ بھی بربادی میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہے،

پھر فرماتے ہیں:۔

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس شعر کے بھی جہاں یہ معنی ہیں، کہ محبُوب کا قد قیامت کے فتنے سے تیار ہؤا، اس لئے وُہ ایک آدمی کے برابر کم ہوگیا ہے، وہاں یہ بھی ہو سکتے ہیں، کہ قیامت کے فتنے ہی نے بجائے خود سمٹ کر محبُوب کی شکل اختیار

کر لی ہے، دُوسری صورت میں اس کا مفہوم میر ممنُونؔ کا وُہ شعر ہو گا
جسے ہم پہلے بھی ایک جگہ ذکر کر آئے ہیں، یعنی :۔

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنونؔ
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

پھر فرماتے ہیں :۔

نہیں معلوم کس کس کا لہُو پانی ہُوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلُودہ ہونا میری مژگاں کا

اس شعر کے بھی ایک معنی تو یہ ہوئے، کہ عشاق تیرے گریہ کی تاب نہیں لا سکتے، اور انہیں تیرا رنجیدہ اور غمناک ہونا کسی حالت میں بھی گوارا نہیں، اس لئے اُن کا خون اس منظر کو دیکھ کے پانی پانی ہو گیا ہے،

اسی طرح دُوسرے معنی یہ پیدا ہوئے۔ کہ تیری پلکیں چونکہ ہر وقت خون آشامی میں مصرُوف رہتی ہیں، اور ان کی سیرابی ہی اسی سے ہے :۔

اِک ایک قطرہ کا دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

— لہٰذا جن بے شمار لوگوں کا خون وُہ اس وقت تک پی چکی ہوئی ہیں، وہی اب آنسوؤں کی شکل میں منتقل ہو کر تیری آنکھوں سے بہہ رہا ہے،

پھر فرماتے ہیں :۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ حقیقت میں بہار کا بیان ہے، ایک معنی اس کے یہ ہوئے، کہ اس موسم کی ہوا بھی اپنے اندر شراب کی سی تاثیر رکھتی ہے، پھر شراب کے پینے اور پیسوں کے ضائع کرنے سے کیا فائدہ،

دُوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں، کہ باہر چل پھر کر ہوا کھانا گویا

شراب نوش کرنا ہے، پہلے معنی کے رُو سے "بادپیمودن" کے معنی "کارِ فضول کردن" ہونگے ،

پھر کہتے ہیں :۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے　　　دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

یعنی جب میں زندہ تھا، تب تو میرا دوست ہاتھ پکڑ کر مجھے محفل سے اُٹھا دیا کرتا تھا، لیکن اب، کہ میں مرچکا ہوں، دیکھیئے کون مجھے یہاں سے اُٹھا کر باہر پہنچاتا ہے، دُوسرے معنی یہ ہوے، کہ میرے "جنازے" کو دیکھیں تو بھلا آج کون اُٹھاتا ہے،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

محبُوب سے کہتا ہے، کہ غیر تو آج ہمیں ذلیل کر رہے ہیں، اور تو چپکے سے کھڑا ہنستا ہے، یہ سلوک تو نے ہمارے ساتھ کیونکر جائز رکھا، جبکہ ابھی کل ہی کی بات ہے، کہ اگر فرشتہ بھی ہمارے سامنے گستاخی سے پیش آتا، تو تو اُسے بھی صبر کے ساتھ دیکھ نہیں سکتا تھا، گویا :۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے　　　کل تلک تیرا بھی دل مہرو وفا کا باب تھا

یہ ایک طور پر محبُوب سے رحم و شفقت کی درخواست کی جا رہی ہے، پھر دُوسرے معنی اور جو زیادہ قرینِ قیاس ہیں، یہ ہوئے کہ "اے خدا! آج ہماری حالت ایسی ابتر اور خراب کیوں ہو رہی ہے، جبکہ تو نے فرشتے کی گُستاخی اور حکم عدولی کو بھی آدم کے حق میں پسند نہیں کیا تھا" یہ اس

آیت کی طرف اشارہ ہے کہ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ الخ یعنی: ”اُس وقت کو یاد کیجے، جبکہ فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم سنایا گیا تھا، سو ان سب نے ہمارے حکم کی تعمیل کی، لیکن شیطان اس سے انکار کر بیٹھا“ (بس اس کفر و انکار کے عوض جو سلوک اُس کے ساتھ روا رکھا گیا، اُسے بھی ایک دُنیا جانتی ہے)“۔

اس مفہوم کی رُو سے مذکورہ شعر کا لہجہ اور بھی زیادہ شکائت آمیز ثابت ہُوا ہے، اور مرزا کے اس دردناک شعر کو یاد دلاتا ہے، کہ:۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سہل ممتنع

جہاں مرزا کے دیوان میں مشکل سے مشکل شعر ہیں، وہاں آسان سے آسان اور صاف سے صاف غزلیں بھی موجُود ہیں، جب وُہ اس خاص انداز پر اُتر آتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا ایک دریائے لطافت بہہ رہا ہے، اور پھر مضمُون کی شعریت بھی کہیں فوت ہونے نہیں پاتی، مثال کے طور پر:۔

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے،
میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجُود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ‎ ‎ غمزۂ و عشوۂ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ‎ ‎ نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ‎ ‎ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید ‎ ‎ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ‎ ‎ اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں ‎ ‎ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اسی طرح :-

کوئی امید بر نہیں آتی ‎ ‎ کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے ‎ ‎ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ‎ ‎ اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ‎ ‎ پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ‎ ‎ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں ‎ ‎ میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا ‎ ‎ بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ‎ ‎ کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ‎ ‎ موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ ‎ ‎ شرم تم کو مگر نہیں آتی

زورِ کلام

ہم اس سے پہلے لکھ آئے ہیں، کہ ایک شاعر کے لئے زوربیان کا پایا جانا بھی نہائت ضروری ہے، چنانچہ غالب کا کلام اس صفت سے بھی عاری نہیں، بلکہ اکثر جگہ اس کے بہترین نمونے ملتے ہیں، ذیل کے اشعار میں دیکھئے، کہ کس قدر جوش اور دبدبہ پایا جاتا ہے :-

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ و صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا
کیونکر کہوں لو نام نہ انکا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

تسلسل اور روانی

ادب اور اُس کے لوازمات میں اسے بھی کلام کا ایک نہائت ضروری اور اہم جزو قرار دیا گیا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ ہمارے نزدیک بھی تسلسل کے بغیر شعر میں نہ تو وجد پیدا ہو سکتا ہے اور نہ موسیقی، بلکہ ایک آورد کا سا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے، جو کسی لحاظ سے بھی قابلِ تعریف چیز نہیں!

چنانچہ مرزا کے دیوان میں تسلسل کے بھی بہترین نمونے دیکھنے میں آئے ہیں، اور ایسے موقع پر اُن کی طبیعت وُہ روانی دکھاتی ہے جس کا ذکر انہوں نے خود ایک جگہ فرمایا ہے:۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل ۔۔۔ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

ذیل کی غزل اس کیفیت کی بہترین مظہر ہے، تعجب ہوتا ہے کہ مفہوم اور مدعا کے ایک ہوتے ہوئے بھی مرزا نے بیان میں اس قدر تنوع اور کشش کہاں سے پیدا کر لی، نمونہ ملاحظہ ہو:۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ۔۔۔ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو ۔۔۔ عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ۔۔۔ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس ۔۔۔ مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ۔۔۔ سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل ۔۔۔ سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب ۔۔۔ نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ۔۔۔ پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب ۔۔۔ عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال ۔۔۔ صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا ۔۔۔ جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ۔۔۔ زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل پہ آرزو ۔۔۔ سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ۔۔۔ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ۔۔۔ سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ۔۔۔ بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیّۂ طوفاں کیے ہوئے

اور بھی انداز ایک دوسری جگہ :-

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے ۔۔۔ سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن ۔۔۔ آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز ۔۔۔ پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلّالِ جنسِ رسوائی ۔۔۔ دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی ۔۔۔ وہی صد گونہ اشک باری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر ۔۔۔ محشرستانِ بیقراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے ۔۔۔ روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　پھر وہی زندگی ہماری ہے

صنائع بدائع

مرزا کو لفظی مناسبات سے قدرتی طور پر نفرت تھی، اور وہ اس انداز کے جانی دشمن تھے، یہی وجہ ہے، کہ ان کے کلام میں محاورات بھی بہت کم پائے جاتے ہیں، اُردو شعراء میں محاورہ بندی کا جنون ذوق کو خاص طور پر گھیرے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے، کہ اکثر جگہ تصنّع کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، اور جہاں تصنّع نے دخل پایا، وہاں اثر مفقود، اور پھر لفظی مناسبات کیلئے تو تقریباً سبھی نحویاں طور پر جان دیتے ہیں، مرزا نے دانستہ کہیں بھی ایسا التزام نہیں کیا ہے، ہاں کہیں اتفاق سے کلام میں کوئی ایسی خوبی پیدا ہو بھی گئی ہے، تو اس سے معانی میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ائمۂ فن کے نزدیک ایسی بے ساختگی اور لفظی یا معنوی صنعت کا شمار محاسن شعری میں ہوتا ہے،

بجنوری مرحوم نے مرزا کے اُردو کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی غیر ضروری تاویلوں اور بیہودہ موشگافیوں کو دخل دیا ہے، وہاں علم بدیع کی نسبت تحریر فرماتے ہیں، :-

"قابل عزت ہیں وُہ تمام فضلاء جنہوں نے علم صنائع وبدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر اُن کی تمام کتابیں جلادی جائیں، تو شعراء کو ذرا بھی نقصان نہیں"[1]

سوال یہ ہے، کہ جب وُہ تمام فضلاء جنہوں نے اس علم کو انتہائی کاوش سے مدوّن کیا ہے، عزّت ہی کے مستحق تھے، تو ان کی نسبت ایسے گستاخانہ الفاظ

---

[1] دیکھو محاسن کلام غالب صـ۱۶ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، ۱۲

کو جائز کیوں سمجھا گیا ؟ — کاش مصنف نے لکھنے سے پہلے اپنے قلم کی اس آوارگی اور بے راہ روی کا اندازہ کر لیا ہوتا ؛ ..... میں نے اس کتاب میں ہر جگہ شعر کے اس پہلو کو بھی اشارات سے واضح کیا ہے، یہاں مستقل طور پر مرزا کے دیوان سے بھی مثالیں پیش کئے دیتا ہوں، ناظرین خود اندازہ فرمائیں :-

صنعتِ تجنیس :-

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

یہاں دیر اور در میں تجنیس زائد و ناقص موجود ہے، اسیطرح :-

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

یہاں بھی نگہ اور نگاہ میں یہی صنعت موجود ہے، لطف یہ ہے، کہ شاعر نے حسن کے استغناء اور عشق کی نیاز مندی کو انہیں دو الفاظ میں ظاہر کر دیا عاشق کے دل کو جو چیز پرواز دیتی ہے، وہ فی الحقیقت کسی کی چشم فسوں ساز کا یہی نیم غمزہ ہے،

صنعتِ اشتقاق :-

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس شعر میں شاہد، مشہود اور مشاہدہ سب کے سب ایک ہی مصدر یعنی شہود سے مشتق واقع ہوئے ہیں، اور یہی اس صنعت کی غائت ہے،

صنعتِ تضاد :-

اب تو محرم جفا بھی ہیں ہم اللہ اللہ — اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

یہاں جفا اور وفا میں صنعت تضاد ہے '

طباقِ سلبی :-

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

طباق سلبی کے معنی ہیں' امر و نہی کا جمع کرنا، مثبت و منفی کے ساتھ' اس لحاظ سے اس شعر میں ناکردہ اور کردہ کے پیش نظر یہ صنعت موجود ہے'

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

پلا دے اوک سی ساقی جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

یہاں بھی نہ دے اور دے اسی صنعت کے ماتحت ہیں' ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے   ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

یہاں بھی نکلا اور نہ نکلا میں طباق سلبی موجود ہے'

صنعت عکس :-

وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ   کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

یہاں الفاظ کی ایک ترتیب قائم کر کے پھر انہیں اُلٹ دیا گیا ہے '

صنعت ترجمۃ اللفظ :-

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز   لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا

رفت کا ترجمہ گیا' اور بُود کا تھا' یہ دونوں ماضی کے صیغے ہیں '

لف و نشر مرتب :- لغوی طور پر لف کے معنی ہیں لپیٹنا' اور نشر کے معنی ہیں کھولنا' شعر میں اس کا قرینہ یوں قائم رکھا جاتا ہے ، کہ

پہلے چند ایک اشیاء کو مرتب کر کے ان کی مناسبات کا حل اسی طور پر دُوسرے مصرع میں کر دیا جاتا ہے، مثلاً :-

آتش و آب و باد و خاک نے لی　　وضع سوز و نم و رم آرام !

آگ کی خاصیت جلانا ہے، پانی کی خاصیت تر کرنا ہے، ہوا گریز کرتی ہے، اور خاک ایک جگہ پہ قرار پکڑے ہوئے ہے، شاعر نے ان تمام خصُوصیّات کو یکے بعد دیگرے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ذکر کیا ہے،

پھر :-

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنّت نگاہ وُہ فردوسِ گوش ہے

کا شمار بھی اسی صنّعت کے ماتحت ہوگا، اسی کی دوسری قسم :-

لف و نشر غیر مرتّب ہے، اس کا امتیاز تو فقط نام ہی سے ظاہر ہے، بات یہاں بھی بالکل وہی ہے، لیکن ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں، مثلاً :-

واں وُہ غرورِ عزّ و نازیاں یہ حجابِ پاسِ وضع　　راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

اس شعر میں محبوب کی نخوت، اور اپنی خودداری کا ذکر کیا ہے، لیکن دُوسرے مصرع میں مفہوم کی اصل ترتیب پہلے مصرع کی نسبت مختلف ہے، اسی طرح :-

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب　　نظّارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

خیال یا تصوّر کی نسبت دل سے ہے، اور نظّارہ کی کی آنکھ کے

ساتھ، لیکن ظاہر ہے، کہ یہاں بھی ترتیب اپنی اصلی شکل پر قائم نہیں رہنے پائی،

صنعت ایہام :-

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

زلف اور سر یہ دو الفاظ ایسے ہیں، جن سے ایہام پیدا ہوتا ہے، لیکن یہاں سر کے معنی کسی چیز کو تسخیر کرنے کے ہیں، روزمرّہ کے مطابق جب ہم کہیں گے کہ " نپولین نے اپنی افواج سمیت اس مہم کو سر کرلیا" تو اس کے معنی یہ ہونگے، کہ اس نے فتح پائی، اور غلبہ حاصل کیا، اسی طرح مرزا کا مطلب بھی یہ ہے، کہ جہاں ایک مدّت سے ہم نالہ و فریاد کر رہے ہیں، اور اس شوخ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، وہاں خدا جانے کتنی عمریں اور درکار ہونگی، کہ ہم اسے اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا سکیں،

اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

یہاں بھی خاک اور غبار سے ایہام پیدا ہوتا ہے، لیکن خاک کے معنی اس جگہ فطرت اور طینت کے ہیں، اسیطرح غبار سے خفگی اور رنج کا مفہوم ثابت ہوتا ہے، پس شعر کا مطلب یہ ہوگا، کہ محبوب جو ہم پہ خفگی کا گمان رکھتا ہے، یہ حقیقت میں غلط ہے، بلکہ عشاق کا شیوہ تو تسلیم و رضا ہے، محبوب سے خفا ہو جانا انہیں کسی حالت میں بھی زیب نہیں دیتا،

حسن و عشق کی اسی نوک جھونک پر خواجہ حافظ کے دو شعر یاد آ گئے فرماتے ہیں :-

صبحدم مرغِ چمن با گلِ نو خاستہ گفت ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نرنجیم و لے ہیچ عاشق سخنِ تلخ بہ معشوق نگفت

صنعتِ جمع :-

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہاں تمام چیزوں کو ایک ہی صفت یعنی پریشانی میں یکساں طور پر جمع کر دیا گیا ہے، اسی طرح ایک اور شعر ہے :-

نیند اُسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اُسکی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ظاہر ہے، کہ یہاں بھی لطفِ خواب کے تمام اسباب کو ایک ہی چیز یعنی وصلِ محبوب سے مقیّد کر دیا گیا ہے،

صنعتِ تلمیح :-

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکونامیٔ فرہاد نہیں

تلمیح کسی خاص واقعہ یا اصطلاح کی طرف اشارہ کرنے کو کہتے ہیں، اس شعر میں فرہاد کے مشہور قصّے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اسکے علاوہ :-

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

اس میں بھی اسی واقعہ کو یاد دلایا گیا ہے، جبکہ زنانِ مصر نے زلیخا کو یہ طعنہ دیا تھا، کہ تو ایک ملکہ ہو کر یوسف پر مری جاتی ہے، آخر وہ کونسا ایسا پری جمال ہوگا، ہوش میں آ، اور خود کو سنبھال! پھر جب انہی عورتوں نے

یوسفؑ کو دیکھا، تو فرطِ حیرت سے انہیں اتنا بھی ہوش نہ رہا، کہ ہم پھل کاٹ رہی ہیں، حتیٰ کہ اپنے ہاتھ بھی شہید کر بیٹھیں،

حسنِ تعلیل :-

جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ

یہاں ذرّہ کے رقص کو بدمستی سے تعبیر کیا ہے، یہ حسنِ تعلیل ہے،

القول بالموجب :-

سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی

اس صنعت کا مطلب یہ ہے، کہ کسی شخص کے کلام کے معنی خلافِ مراد قائل لینا، چنانچہ ظاہر ہے، کہ مرزا نے رقیبوں کی نسبت کہا تھا، کہ انہیں محفل سے نکال دیا جائے، لیکن اس شوخ چشم محبوب نے جان بوجھ کر خود مرزا کو اپنی محفل سے اُٹھا دیا،

صنعتِ متحمل الضدّین :-

اس کا مطلب یہ ہے، کہ شاعر کا کلام دو متضاد معنی رکھتا ہو،

ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بےخوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ نازِ محوِ بالشِ کمخواب تھا

جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا — یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزمِ بیخودی
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا — فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا

ان میں سے ہر شعر اپنے اندر دو متضاد کیفیتیں رکھتا ہے، ایک مصرع میں اپنی زبوں حالی اور تباہی کا ذکر کیا ہے، تو دوسرے مصرع میں محبوب کی خوش ادائی اور عیش و عشرت کا نقشہ کھینچا ہے، یہ غزل حسنِ بیان کی ایک بہترین مثال ہے، !

فلسفۂ غم — اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا گیا ہے، کہ مرزا کا فلسفۂ حیات نہائت تلخ ہے، اور اس میں جگہ جگہ غم اور افسردگی کے آثار دکھائی ہیں، مثلاً :-

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک — غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں — قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن — نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی — ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

اور اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ؛— لیکن کیا ایک فلسفی کے نقطۂ نظر سے ان باتوں میں انسانی زندگی کے لئے کوئی مفید سبق نہیں ہے ؟ : ہم کہیں گے کہ ایک صاحبِ بصیرت شخص ان سے بھی کافی حد تک اپنے کیرکٹر اور جذبات کی اصلاح کر سکتا ہے، اور خاص کر ایسی حالت میں جبکہ خود مرزا نے بھی اسکی غائت پر بدرجۂ اتم روشنی ڈالی ہو، اور وُہ اس طرح کہ :-

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

اور صرف غالبؔ ہی پر کیا موقوف ہے، دُنیا کے اور بہت سے شاعر بھی اپنے اپنے انداز میں غم کو انسانی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک قرار دے چکے ہیں، منجملہ اُن کے گوئٹے ہی کو دیکھ لیجئے، اپنے جذبۂ عشق کی تجدید اور استقرار کے لئے غم کو کتنی ضروری چیز سمجھتا ہے، چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:۔

"خدا کرے، وہ آنسو کبھی خشک نہ ہونے پائیں، جو اپنے اندر محبت کی ایک دائمی مسرت رکھتے ہیں، افسوس! جب ان میں سے ایک آنسو بھی خشک ہونے لگتا ہے، تو دُنیا کس قدر اُداس اور مرجھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ گویا اس کی رُوح مُردہ ہو گئی، سو ہاں، میری آرزو تو یہی ہے کہ غمِ ہجراں میں بہنے والے آنسو کبھی خشک نہ ہونے پائیں!"

دیکھا آپ نے؟ محبت کا جوش غم کی تلخی کو کس طرح فراموش کرا دیتا ہے، پھر ایک دوسری جگہ بھی سوال و جواب کے طور پر اس کی طبیعی اور نفسیاتی حیثیت پر یُوں روشنی ڈالتا ہے، :۔

"اے دوست! یہ کیا بات ہے کہ تو غمناک حالت میں سر جھکائے بیٹھا ہوا ہے، حالانکہ تیرے تمام رفیق شاداں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں؟۔۔۔ تیری آنکھوں سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے، کہ تو زار و قطار رویا ہے، وہ سُوج کر ورم کر آئی ہیں، آخر اس بے قراری کا سبب کیا؟"

"ہاں! اگر میں رویا بھی ہُوں، تو میرا یہ رونا تنہائی اور عزلت نشینی میں ہے کہ جہاں سوائے میرے اور کوئی غمگسار موجود نہیں، یہ آنسو میرے لئے بہار کی

سی نکہت اور تر و تازگی لاتے ہیں، اور اس طرح میرے دل کو ہر قسم کی تشویش سے نجات مل جاتی ہے۔

گویا :-

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

تو اس لحاظ سے معلوم ہُوا کہ طبیعت کی شگفتگی اکثر حالتوں میں نالہ و فریاد اور گریہ و زاری پر موقوف ہے، اس سے پہلے بھی یہ فلسفہ ایک جگہ ذکر کیا جا چکا ہے، اس مقصد کے لئے وُہ شعر دوبارہ پیش کئے دیتا ہوں :-

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالبؔ
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

اس کا مطلب یہ ہے کہ :-

سینہ کا داغ ہے وُہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وُہ قطرہ کہ دریا نہ ہُوا

نظیریؔ کہتا ہے :-

خاطر بخندۂ گُل و مُل دائمی شود !
غیر از گریستن غمِ دل را علاج نیست

اقبالؔ نے بھی فطرت کے ان لطیف اور نازک تاثرات کو بڑی خوبی سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، چنانچہ بانگ درا میں "فلسفۂ غم" ہی کے زیر عنوان ایک جگہ فرماتے ہیں :-

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی دامن میں رکھتا ہے سحابِ زندگی

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

غم نہیں غم رُوح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرُودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

اور بالآخر اس کے سب سے بڑے فائدے کو بھی نظر انداز نہیں ہونے

دیا ہے، اور فرماتے ہیں :۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

خاتمہ

بات میں سے بات پیدا ہوتی گئی، اور سلسلۂ کلام نے بہت طول پکڑ لیا، اب قلم کا سفیر بھی آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے، اور میں خود بھی متعجب ہوں، کہ :۔

لکھتے نامہ لکھے گئے دفتر شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

بس! اے میرے سچے مونس اور ہمدم، بس! اب تھوڑی دیر کے لئے ٹھیر جا، اور ذرا تحمل سے کام لے؛ تیری وفاداری مسلّم اور تیری جرأت و استقلال میں کوئی کلام نہیں، لیکن یاروں کی طبیعت کا بھی تو کچھ اندازہ کیا چاہیئے، مانا کہ قدرت ہمیشہ ایک نئی دنیا تعمیر کیا کرتی ہے، اور ذوقِ نمود ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، لیکن وقت کا سیلان بھی تو وہ بلا کی طاقت ہے، کہ اُسے تباہ و برباد اور درہم برہم کر کے پھر سے نئی بنیادیں استوار کر دیتا ہے، ہاں، تو اس کے لئے خدا کے سامنے کیوں التجا نہ کروں کہ الٰہی! آسمان و زمین کی یہ تمام وسعتیں تو ایک ہی جست میں طے ہو گئیں، بتا کہ اب تمنا کا دوسرا قدم کہاں سے لاؤں؟ :۔

یا مکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یاچنیاں کن یا چنیں!

میرے جسم کے اندر تو نے گوشت کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا تو پیدا کردیا، لیکن بتا کہ اب اس کے قیامت خیز ہنگاموں کو کون سنبھالیگا؟:

آہ دُنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں   پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

عشق! اُف، عشق کی طاقت؟' اس کرۂ ارضی کو پاش پاش کردینے والی طاقت' خوفناک پہاڑوں کو بھی مسمار کردینے والی قوت! خیر پھر تو بھی دیکھ، زندگی کی تسخیر کا ذرا غور سے معائنہ کر۔۔۔ کچھ حرج نہیں، اگر عرصۂ کائنات اس قدر محدود ہے، ۔۔۔ کوئی مضائقہ نہیں، اگر ستارے جگمگا کر نظر سے غائب ہوجاتے ہیں، ۔۔۔ موت کا خیال مجھے مغلوب نہیں کرسکتا، لیکن ہاں تجھے بھی اتنا ضرور سُن لینا چاہیئے، :-

نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجھکو   عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خمخانہ بنایا ہوتا

غالب! لے کہ اب میں تجھ سے رخصت ہوتا ہوں، اے مشرق کی زندۂ جاوید ہستی! اشکوں کا خراج مجھ عاجز سے قبول کر، یہ آنسو وہ آنسو ہیں جنہیں میں نے مہینوں نہیں، بلکہ برسوں سے صرف تیرے ہی لئے اپنی آنکھوں میں محفوظ رکھا تھا؛ یہ عقیدت کے چند قطرات' یہ نذرِ حقیر قبول کرلے، جو آرزو ایک ماہیِ بے آب کی مثل ہمیشہ سے مجھے تڑپاتی رہی، وہ آج پوری ہوتی ہے' اور میں نے مقدور بھر تیری خدمت کردی!

وہی تجھے سمجھیں گے، جو ایک نظرِ حقیقت شناس رکھتے ہیں، اور وہی تجھے اپنے سینوں میں جگہ دینگے، جو اپنے پہلو میں ایک دردمند دل لیکر اس دنیا میں آئے ہیں، اے ملکِ معانی کے پیغمبر! تو نے کہا، اور بجا طور پر کہا، کہ:

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل انکو جو نہ دے مجکو زباں اور

دل کا سوز بھی سہی، لیکن پہلے تجھ سا کوئی بالغ نظر تو پیدا ہولے، پھر وہ تیرے کلام کو بھی سمجھ لیگا:

ترا چنانکہ توئی ہر کسے کجا داند — بقدرِ ہمت خود می کنند استدراک

تیرے حسنِ گفتار نے کائنات کے ذرّے ذرّے کو مدہوش کر دیا ہوا ہے، روحیں تیرے نغموں کے لئے بیتاب اور تشنہ ہو رہی ہیں آئندہ نسلیں تیرے انتظار میں ہیں، ابھی ایک دور گذر تو لینے دے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے:۔

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن — دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

کیا کہیئے اور کہاں تک تیری تعریف کرتے چلے جایئے، جسطرح ایک حسین چہرہ ہر قسم کی آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہوا کرتا ہے، اسیطرح تیری شاعری بھی کسی مدح و ستائش کی شرمندۂ احسان نہیں!

روحِ غالب! ایک دفعہ پھر نمودار ہو، اور اپنے ایک دیرینہ رفیق کو جسکی نظریں مدت سے تیرے لئے بھٹک رہی ہیں — جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں، اپنی تجلّی اور ایک روح افزا عرتجلّی سے لذّت یاب ہو لینے دے — میں سراپا انتظار ہوں!

(کتبہ: عبدالمجید خوشنویس لاہور)

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس رفقاء، مجلس انتظامی، صدور شعبہ جات و نظما پانچ کتابیں ایک بار ایک ماہ کے لیے [illegible] کر سکیں گے۔

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیات [illegible] کتابیں ایک [illegible] کے لیے لے سکیں گے۔

۳۔ اراکین دار الترجمہ [illegible] رجسٹر شدہ دو کتابیں [illegible] ایم اے، ایل ایل بی و تحقیقات کے طلبہ [illegible] لے سکیں گے۔

۴۔ طلبہ [illegible] کتابیں [illegible] ہفتہ کے لیے [illegible] لے سکیں گے۔

۵۔ [illegible] کتابیں [illegible] جاری کی جا سکیں گی [illegible] کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو مستعیر [illegible] ہوگا۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان پنسل یا روشنائی کا [illegible] نہ لگایا جائے۔

۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں جاری نہیں کی جا سکیں گی۔ فقط